ناولٹ

کھوئے کھوئے لمحے

تابندہ نعیم

پاکستان کی انتہائی معتبر، انتہائی خوب صورت اور انتہائی گہرے جملے لکھنے والی مصنفہ رفعت ناہید سجاد کے انداز تحریر سے متاثر ہو کر شروع کی جانے والی یہ کہانی گزشتہ کئی سالوں سے ٹکڑوں کی شکل میں لکھی جاتی رہی۔ اس عرصے میں پاکستانی معاشرہ تبدیل ہوچکا ہے۔ اب پاکستان کے پبلک پارکس میں شاید ہی کوئی غیر ملکی خاتون پاکستانی طالبات کو شام کی تفریح کرانے نکلتی ہو... مگر ہمارے آپ کے اسی پاکستان میں کبھی ایسا ہوا کرتا تھا۔ کہانی فرضی ہے۔ اس کے واقعات سن انیس سو ستاسی سے انیس سو پچانوے تک کے حالات اور کرداروں پر مبنی ہیں، تاہم ان کی کسی حقیقی کردار یا واقعے سے مماثلت محض اتفاقیہ ہوسکتی ہے۔

لاہور

10 اگست 1991ء

وہ ٹھٹک کر رکا تھا اور چونک کر مڑا تھا۔

وہ تینوں غیر ملکی خواتین، مارکیٹ کے اس بڑے سپر اسٹور میں دکاندار سے قیمت کم کرانے کی پاکستانی اسٹائل کی زنانہ بحث میں الجھی پیچھے انتظار میں کھڑے دیگر خریداروں کی تنگیٔ وقت سے قطعاً بے خبر معلوم ہوتی تھیں۔ وہ ان تینوں میں بالکل بائیں طرف والا انتہائی
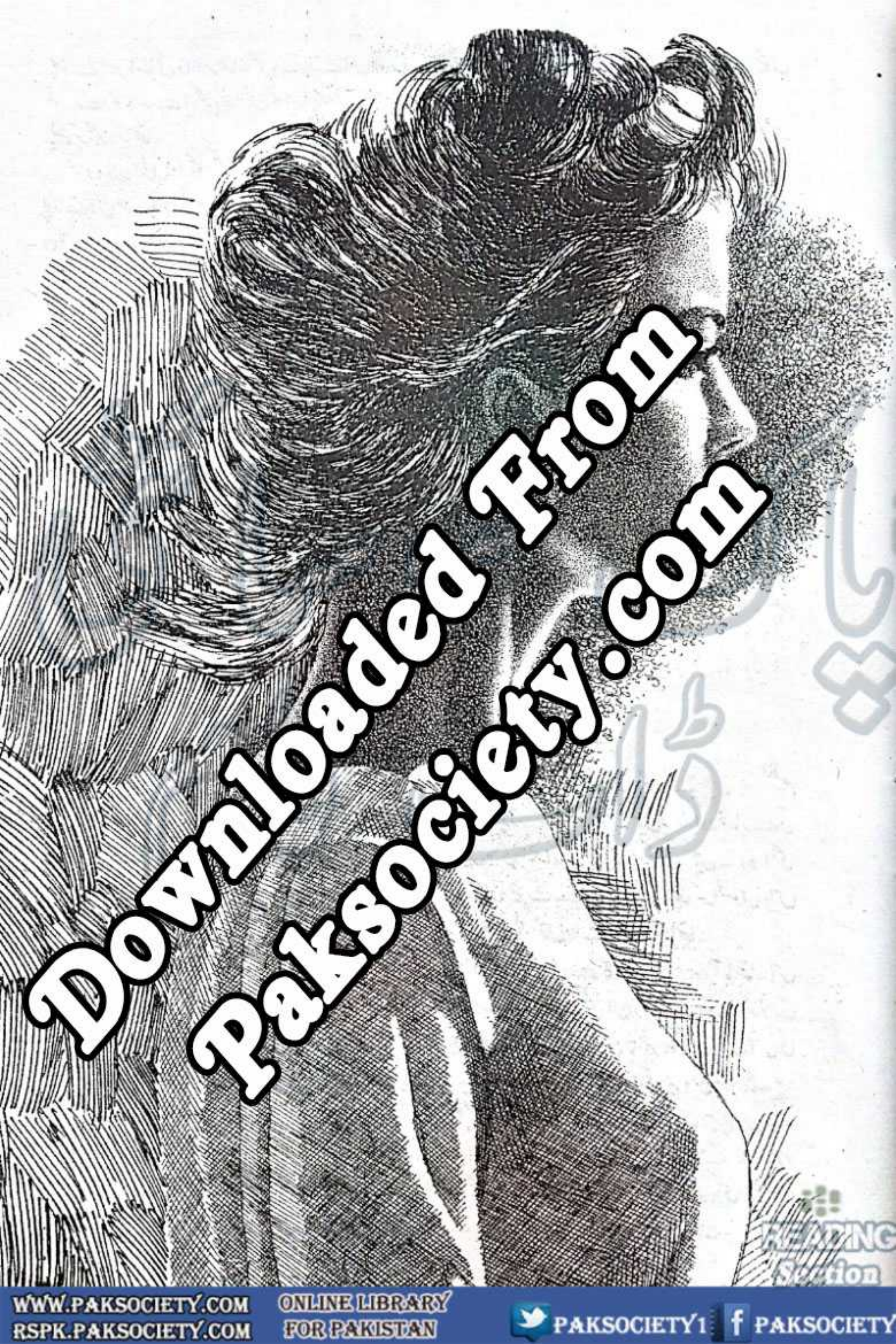
چھوٹے ہیئر اسٹائل والا سر تھا۔ جس نے اسے اس قدر غور سے دکاندار سے الجھی خواتین کا ایسا بھرپور جائزہ لینے پر مجبور کیا تھا۔

وہ ان کی ادائیگی مکمل ہونے کے انتظار کے پورے دس منٹ انتہائی صبر سے اس بات کا منتظر رہا کہ وہ لڑکی ذرا سا اپنا رخ اِدھر کو موڑے تو وہ اس کا چہرہ دیکھ سکے...... لیکن وہ سر تو جیسے فریم میں جڑا تھا...... اس نے نہ جنبش کی نہ دکاندار سے بحث میں الجھی نہ اپنی ساتھی خواتین کو مشورہ دینے کے لیے ہی اپنا رخ موڑا۔ وہ اسے یونہی اندازے سے مخاطب کر کے شرمندہ نہیں ہونا چاہتا تھا۔

گاہکوں کی قطار لمبی ہوتی دیکھ کر، ایک دوسرا خوش شکل سیلز مین مدد کو آگے بڑھا تھا۔

''سر آپ کی کیا خدمت......؟'' اس نے گردن گھما کر سیلز مین کو دیکھا جو بظاہر اپنے مہذب نظر آنے والے گاہک کو سوتی شلوار دوپٹے میں ملبوس، غیر ملکی خواتین کا جائزہ لیتے دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ فہد نے دوسرے کاؤنٹر کی طرف بڑھنے کے بجائے اسٹور سے باہر جانے والے راستے کی طرف قدم بڑھا دیے۔

اسے یقیناً کوئی غلط فہمی ہوئی تھی۔ اسے یہاں سے جو بھی خریدنا تھا، اس کے لیے پھر بھی آیا جا سکتا تھا۔ اس کی گاڑی قریب ہی کھڑی تھی لیکن ابھی اگنیشن میں چابی گھمائی نہیں تھی کہ اس نے دیکھا، وہی تینوں غیر ملکی لڑکیاں اسی اسٹور سے چند شاپنگ بیگز اٹھائے باہر نکل رہی تھیں۔

بلاشبہ یہ یادداشت کے آنے یا جانے کی کوئی فلمی کہانی نہیں تھی...... وہ وہی تھی، سو فیصد وہی...... اسے کوئی غلط فہمی نہیں ہوئی تھی۔

مگر اس سے پہلے کہ وہ گاڑی کا دروازہ کھول کر باہر نکلتا اور اپنا تعارف پیش کرتا، ایک چمکدار ہونڈا اکارڈ کے تیز رفتار ڈرائیور نے اس کی گاڑی کے عین ساتھ، اپنی گاڑی ایسے لگائی کہ وہ دروازہ کھولنے کا ارادہ ہی کرتا رہ گیا۔ اس نے گاڑی ریورس کر کے باہر نکالنے میں تیزی دکھائی مگر اس عرصے میں، وہ تینوں لڑکیاں اس کی نظر سے اوجھل ہو چکی تھیں۔

اس نے گول چکر (چورنگی) کے گرد، انتہائی آہستہ رفتار سے، دوسرا چکر لگاتے غور کیا کہ آج اس کے ساتھ یہ ہوا کیا تھا۔

اس کی زندگی میں پشیمانیاں پالنے کی فرصت کم تھی۔ ایسے میں وہ ایک لمحہ، جو لبرٹی کے راؤنڈ اباؤٹ کے پاس اس کے ہاتھ سے پھسلا تھا، اس پر غور کرنے کی مہلت اسے دوبارہ اگلے کئی دنوں بعد ہی مل پائی۔

''وقت کتنی تیزی سے گزر رہا ہے۔'' اس نے آج کے آخری مریض کو تسلی آمیز باتوں کا انجکشن لگا کر رخصت کرنے کے درمیان سوچا۔ وہ ان دنوں سخت مصروف تھا مگر جانتا تھا کہ میڈیکل کے شعبے کی کوئی ریسرچ، مریضوں سے رابطے سے بڑھ کر نہیں ہو سکتی۔

''اس لیے بیکار پچھتاوؤں میں وقت ضائع کرنا بالکل مناسب نہیں ڈاکٹر صاحب......'' اس کے اندر سے ایک دوستانہ مشورہ برآمد ہوا تھا۔

☆☆☆

لاہور

12 اگست 1991ء

لیکن اتفاقات حقیقت بھی بنتے ہیں...... عظیم نقصانات پورے بھی ہو جاتے ہیں...... اور خسارے کی تحریریں کبھی کبھار دُھل جایا کرتی ہیں۔ وہ ابھی انکشاف کی حیرت سے سنبھل ہی رہا تھا کہ افسوس، اس کے بعد کا لمحہ پھر کہیں راستے میں گر گیا تھا۔

وہ بہت تیزی سے گاڑی چلاتا ہوا آیا تھا۔ اس لیے کرکٹ ہاؤس سے نکلتی ان دو لڑکیوں کو دیکھ کر فوری بریک لگاتے میں کچھ لمحے کی تاخیر ہو گئی۔ جب اس کی کار کے پہیے رکے تو وہ جیل روڈ کی نہر والی کراسنگ پر، سرخ سگنل اور لاتعداد گاڑیوں کے درمیان یوٹرن لینے کا راستہ ڈھونڈتا ہی رہ گیا۔ اس کی گاڑی کے سائڈ مرر میں پیچھے رہ جانے والی، پیدل چلتی لڑکیاں کسی نامعلوم راستے پر جا کر نظروں سے اوجھل ہو چکی تھیں۔

بس ایک لمحے کی بات تھی...... دوسرا لمحہ وہ تھا جب اس نے یوٹرن لیا، گاڑی دائیں طرف کا رخ موڑ کر واپس گھمائی اور یہ جانتے ہوئے بھی وہ ایک بار پھر اس کی نظروں کے سامنے سے غائب ہو چکی ہے، اسے ڈھونڈنے کی پوری کوشش کی تھی۔

☆☆☆

لاہور

10 ستمبر 1991ء

تیسری بار پھر...وہ اسے اسی سڑک پر دکھائی دی۔ آج بھی وہ اکیلی نہیں تھی۔ نئی بات یہ تھی کہ آج وہ بھی اکیلا نہیں تھا۔

آج اسے ریما کو کالج سے گھر چھوڑنا تھا۔ اس کی بہن، کالج کے سبز گرل والے گیٹ سے اس کی گاڑی دیکھتے ہی اپنے ہاتھ میں مسالے والا مکئی کا بھٹا سنبھالے اپنی دوستوں کو خدا حافظ کہتی باہر آئی۔ وہ ابھی دروازہ کھول کر ٹھیک سے بیٹھی بھی نہیں تھی کہ اس کا بھائی گاڑی آگے بڑھا چکا تھا۔

وہ سخت عجلت میں تھا۔ اسے ریما کے ”کتنی گرمی ہے اور چھلّی کھائیں گے نا“ والے والہانہ جملوں میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

ریما کو لگا، اسے کہیں پہنچنے کی جلدی ہے۔ وہ سامنے دیکھ کر گاڑی چلانے کے بجائے اپنے دائیں طرف کی کھڑکی کے پار، کسی کو کھوجتا لگ رہا تھا۔

ریما نے بھائی کی نظروں کے تعاقب میں، دائیں طرف کے اس پار والے منظر پر نظر ڈالنی چاہی۔ اور بس وہی لمحہ تھا جب ایک بے حد بوسیدہ سی وین، عمرا ہسپتال کے سامنے رکی بھی اور چل بھی پڑی۔

وہ اب وہاں نہیں تھی۔ وہ کھٹارا سی وین، آج پھر اسے اپنے پروں میں چھپائے فہد کے اگلے راستے گم کیے دے رہی تھی۔

”یہ کتنا عجیب اتفاق ہے۔“ وہ بری طرح مایوس ہوا۔

اور یہ کتنی عجیب بات تھی کہ اس کے ساتھ یہ اتفاق بار، بار ہو رہا تھا آخر کیوں......؟

”آپ چلتے کیوں نہیں؟“ ریما کی ناراض سی آواز اس کے کانوں میں پڑی۔ اور اسے احساس ہوا کہ سڑک کے پار کا منظر بدلتے دیکھ کر اس نے بے اختیار بریک لگائی تھی اور پاؤں اٹھانا بھول گیا تھا۔

”سوچنے کی بات یہ بھی تھی کہ آخر وہ کیوں اس سے ہر قیمت پر ملنا چاہتا ہے۔“ اس نے بریک سے پاؤں اٹھاتے، ایک دفعہ پھر سوچا۔

لیکن یہ محض اتفاق نہیں تھا کہ وہ اس سڑک سے ایک بار نہیں، بار، بار گزرا...... یہ اس کا روز کا راستہ نہیں تھا۔ ریما متجسس تھی کہ اس کا بھائی جو کبھی لنچ کرنے گھر نہیں آتا، ان دنوں اپنے انتہائی مصروف اوقاتِ کار سے فرصت نکال کر اسے کالج سے گھر ڈراپ کرنے لگا تھا۔

☆☆☆

15 ستمبر 1991ء

اسے کوئی سراغ نہیں مل سکا تھا۔

پچھلے چند دنوں میں وہ اس جیل روڈ پر سے جانے کتنی بار گزرا ہوگا۔

”اور یہ لاہور شہر آخر کتنا بڑا ہے؟“

اس نے آج کی تاریخ کے ڈوبتے سورج کو بادشاہی مسجد کے میناروں سے پرے دیکھ کر سوچا...... شاہی قلعے کی برجیاں ماند پڑ جانے والی کرنوں کی روشنی سے اور بھی سرخ ہو رہی تھیں۔ اسے اپنی تلاش کے لاحاصل اور حماقت انگیز ہونے کا احساس بھی تھا۔

”اگر وہ اس شہر میں موجود تھی تو کیا اتنی ہی فرصت سے ہوگی کہ آج، ابھی، اس شہر کے تاریخی مقام دریافت کرنے ضرور یہاں آئے گی۔ ہاں...... ٹھیک ہے، وہ ایک عجیب سے جنون کا شکار ہو رہا ہے پھر بھی کچھ عقل سے کام لینا چاہیے۔“ اس نے خود کو خود ہی سمجھایا۔

وہ کوئی بیروزگار نہیں تھا...... اس کے کام کا حرج ہو رہا تھا۔ زندگی میں ایسی بے وقوفیوں کی گنجائش رکھی ہی نہیں جا سکتی۔

☆☆☆

20 ستمبر 1991ء ... اور پھر کمال ہو گیا۔

وہ کسی کام سے سروسز اسپتال آیا تھا اور اب اس نے واپسی کے ارادے سے اپنی گاڑی اسپتال کے مین گیٹ سے نکالی ہی تھی۔ ریس کورس پارک کے سگنل سے بائیں طرف مڑتے ذرا سی دیر میں اس نے دیکھا کہ اپنی صحت سے محبت کرنے والے لاہوریوں کی ایک بڑی تعداد شام کی سیر کرنے پارک میں جارہی تھی۔ اور لڑکیوں کا وہ گروپ جو اس کے سامنے ابھی ابھی پارک میں داخل ہوا تھا، اس میں ایک وہ بھی تھی۔ اس بار اس نے وقت ضائع نہیں کیا۔

اس نے گاڑی پارک کی ذیلی سروس روڈ پر لگائی......اور انتہائی عجلت میں تیز تیز چلتا ہوا، مین گیٹ سے اندر داخل ہوا۔ انہیں ڈھونڈنے میں اسے زیادہ وقت نہیں لگا۔

وہ اکیلی نہیں تھی...... وہ ایک گھونگریالے، بھورے بالوں والی انتہائی دراز قد، غیر ملکی لڑکی کے ساتھ تھی۔

وہ جانتا تھا اگر آج کا یہ لمحہ اس کے ہاتھ سے نکل گیا تو وہ اسے دوبارہ ڈھونڈنے میں شاید کبھی کامیاب نہ ہو سکے۔

وہ لپک کر قریب گیا تھا اور اس نے وقت ضائع کیے بغیر پکارا تھا۔

''ہیلو، سبرینہ......''

وہ جو اپنی طرف سے پارک کے قدرے کم رونق والے حصے میں جویریہ ہاسٹل کی لڑکیوں کو تفریح کرانے لائی تھی، خوف سے سن ہوگئی۔ وہ اس بڑے شہر کے ہنگامے میں، صرف اور صرف شناسا چہروں سے ہی بچتی پھر رہی تھی۔ اس کی شکل پر کچھ ایسا تھا.... جیسے کسی نے اسے رنگے ہاتھوں پکڑ لیا ہو۔ اس نے اس کے رنگ اڑتے چہرے کو بھی دیکھا تھا اور اس کی آنکھوں کی ہراساں سی بیگانگی کو بھی۔

مگر وہ زیادہ دیر انتظار نہ کرسکا اور انگریزی میں بولا تھا۔

''تم نے مجھے پہچانا نہیں......؟ میں فہد ہوں، فہد مرتضیٰ......'' اس کے چہرے کے رنگ اڑتے تاثر میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔

''تم ایڈنبرا میں تھیں ناں......ہم وہاں مل چکے ہیں۔'' وہ آخر کہاں کہاں سے بھاگے گی......زندگی میں انسان کو فرار کے کتنے موقع ملتے ہیں بھلا......؟ وہ کسی حقیر سے خوفزدہ چوہے کی طرح گھر کر مارے جانا نہیں چاہتی تھی۔

''تم یقین نہیں کروگی کہ میں تمہیں کتنے دنوں سے ڈھونڈ رہا ہوں۔'' وہ اپنی شُستہ انگریزی میں جو کہہ رہا تھا، یقیناً اس کا لغوی مطلب بھی وہی تھا۔

''تو کیا وہ سوچ لے کہ اس کی اڑان بس یہیں تک تھی؟'' اتنی تھکا دینے والی طویل پرواز کے بعد کسی نے اس کی ڈوری کھینچی اور پھڑ پھڑاتی ہوئی وہ زمین پر آرہی۔ اس نے دیکھا، اس کے سامنے کھڑے شخص کی آنکھوں میں، ایک انوکھی سی چمک تھی۔ اس نے فرار کی بے فائدہ کوشش کے لیے کچھ دور بیڈمنٹن کھیلتی چڑیوں کی طرح چہچہاتی لڑکیوں کے گروپ کی طرف نظر دوڑائی مگر وہ اس کے ارادے بھانپ چکا تھا۔

''سبرینہ گیبرئیل......!'' اس نے ذرا جھک کر کہا۔

''آپ کی مہربانی ہوگی اگر آپ مجھے بتادیں اگلی بار میں آپ سے ملنا چاہوں تو مجھے آپ کو کہاں تلاش کرنا چاہیے۔ معاف کیجیے...... اگر آپ دوبارہ گم ہوگئیں تو میں آپ کو کہاں ڈھونڈتا پھروں گا؟'' اس کے اٹھتے قدم رکے۔

شرارت آمیز دوستانہ انداز، جس میں حکم نہیں شکوہ سا تھا۔ وہ ایسے لہجوں کی بالکل عادی نہیں رہی تھی۔ اس نے ایک لمحے کا توقف کیا لیکن رکنے کا ارادہ بالکل ترک کرکے دوبارہ لڑکیوں کی طرف قدم بڑھادیے۔

''دیکھو......'' وہ اس کے ساتھ آیا۔ ''تم میری بات کا جواب تو دے سکتی ہو؟''

لڑکیوں کا گروپ، اس گھونسلے جیسے بالوں والی لمبی لڑکی کے ساتھ بے پروا ہنسی بکھیرتا ان کے قریب آرہا تھا۔

"کیا تم نے مجھے واقعی نہیں پہچانا؟"

اس نے بغیر سوچے سمجھے انکار میں گردن ہلاتے ہوئے دیکھا۔ مہربان لہجے والا شخص توجہ سے، اس کی ایک ہاں یا نہ کا منتظر کھڑا تھا۔ وہ ڈگمگا گئی۔

فہد مرتضیٰ اگر دماغ پر ذرا سا زور دیتا تو سوچ سکتا تھا کہ اس کے سامنے کھڑی لڑکی کے انداز میں خود مختاروں والی تو کوئی بات نہیں تھی۔ وہ جیسے کسی فیصلے تک پہنچنے کی کوشش میں اپنے آپ سے الجھتی لگ رہی تھی۔ پھر کسی اکتا دینے والی گھڑی میں وہ اس کھیل سے بھی تنگ آ گئی۔

"میرے پہچاننے یا نہ پہچاننے سے کیا فرق پڑتا ہے؟"

فہد کی مسکراہٹ بے ساختہ تھی۔

"شکریہ...... ورنہ مجھ سے بڑا بے وقوف اس شہر میں کوئی نہ کہلاتا۔" اسے کچھ کچھ یاد آیا، وہ شخص تو شاید ایسا ہی تھا۔ حالات اور وقت صرف اسی کے لیے تبدیل ہوئے تھے۔

اور ممکن ہے، یہ سب ویسے نہ ہو جیسے وہ سمجھ رہی ہے۔ دوست اور دشمن لہجوں میں اتنا فرق بھی نہیں ہوتا۔

کسی گہری مشکل سے نکل کر اس نے ہلکے سے مسکرانے کی کوشش کی۔

"اور...... سب کیسے ہیں؟"

"اور سب کون......؟" فہد کے منہ سے نکلا پھر جیسے اس نے اپنے جملے پر نظر ثانی کر لی۔

"واپس آنے کے بعد پچھلے کچھ سال، میں اتنا مصروف رہا کہ کسی سے زیادہ ملنے کا موقع نہیں ملا۔ تمہاری کسی سے ملاقات ہوئی؟"

اس کے سامنے کھڑے شخص کی آنکھوں میں یہ پڑھنا مشکل نہیں تھا کہ اس کے خدشے بے بنیاد ہیں پھر بھی یقین اور بے یقینی کا درمیانی فاصلہ پل صراط بنا ہوا تھا۔

"نہیں......" اب وہ آنے والے حالات کا سامنا کرنے کے لیے بالکل تیار تھی۔

"میں تو کسی سے ملی نہیں۔" کیا فائدہ ایسی سچائیوں کا جو آپ کی غلطیوں کا اشتہار بنا کر بل بورڈ پر لگا دیں۔

"یونہی تمہیں دیکھ کر مجھے خیال آیا......"

کم عمر لڑکیوں کی بے پروا ہنسی نے رابطہ بڑھاتی گفتگو کا یہ مشکل قائم ہوا تسلسل توڑ دیا تھا۔ بھورے رنگ کے بالوں والی لڑکی اپنی کلائی پر بندھی گھڑی کی طرف اشارہ کرتی اس سے واپسی کا ارادہ معلوم کر رہی تھی۔

"تم بتاؤ گی نہیں کہ تم کہاں ٹھہری ہوئی ہو؟" فہد کو لگا کہ وہ اس پر ایک نظر اور ڈالنے کی تکلیف گوارا کیے بغیر دوبارہ کھو جانا پسند کرے گی۔ چند منٹوں میں اس نے اس کے چہرے کو بہت سے حساب کتاب کرتے دیکھا تھا۔ فہد نے اپنے پرس سے ایک کارڈ نکال کر اس کی طرف بڑھاتے اپنا پین اسے پیش کرتے اس کے چہرے پر لکھے زبردست گریز کو صاف محسوس کیا تھا۔ اب وہ کارڈ اپنی ہتھیلی پر الٹ کر کچھ نہ کچھ لکھ رہی تھی۔

کارڈ پر نظر ڈال کر وہ خوش ہو گیا۔

"پڑھتی ہو وہاں؟"

"پڑھاتی ہوں۔" وہ اس سے اس کا وزیٹنگ کارڈ لیے بغیر جا چکی تھی۔ پھر بھی فہد کو لگا مغرب میں گرتے سورج کی کرنیں آج کچھ روشن روشن سی تھیں۔

☆☆☆

"بہت بڑی غلطی ہو گئی تھی۔ پتا نہیں وہ سچ بول رہا تھا یا جھوٹ...... اور کیا پتا جو......" ایک اونچے قہقہے نے اس کی توجہ کھینچی...... سونیا کا چہرہ جوش سے سرخ تھا۔ وہ اینڈریا کے ہاتھ پر ہاتھ مار کر، آج کے کسی غیر اہم واقعے کو، ناقابلِ فراموش ثابت کرنے پر تلی ہوئی تھی۔ وہ اسپتال کی لڑکیوں سے زیادہ فاصلہ رکھنے کی قائل نہیں تھی۔ وہ جتنا سونیا کو جان چکی تھی وہ جونیئر اور سینئر ہاسٹل کی تمام وارڈنز اور لڑکیوں میں سب سے بڑی ڈراما کوئین تھی۔

"کس قدر بے تکا ہنستی ہے یہ سونیا......"

اس نے خفیف سی ناگواری سے اپنی نظر ہٹا لی۔ ہاسٹل کا کامن روم جو شام کو ٹی وی روم بن جاتا تھا۔ محبت کی کسی لازوال کہانی پر مبنی ڈرامے کے نشر ہونے کا منتظر تھا۔ کمرا بے فکر لڑکیوں سے بھرا ہوا تھا۔ سبرینہ نے اپنی توجہ واپس اسی نکتے پر مرکوز کی، جس نے کم از کم آج کی رات تو اس کی نیند اڑا ہی ڈالی تھی۔

''اور اگر اس کے سارے شک ٹھیک نکلے تو......؟'' اس نے زندگی میں بہت سی غلطیاں کی تھیں، بہت سے غلط فیصلے کیے تھے۔ اسے یقین تھا یہ خوف سے بھری زندگی اور اندیشوں کے عفریت اس کی سزائیں ہی ہیں...... لیکن ہاں، اگر آج اس سے غلطی ہوئی تھی تو اب تک کی تمام غلطیوں میں یہ سب سے بڑی ہے۔ اور اب یہ کون، کون سے عذاب نہیں لائے گی...... یہ سوچ کر اسے جھرجھری آگئی۔

اور بھلا کیا ہو جاتا، اگر وہ اسے پہچاننے سے انکار کر دیتی تو...... مگر اس سے اتنی بڑی حماقت ہوئی کیوں آخر...؟ کیا اس لیے کہ وہ دشمنوں میں سے نہیں لگ رہا تھا۔ یا اس لیے کہ وہ بہت دنوں بعد باہر نکلی تھی اور زندگی کے تمام بڑے سوال بھلا کر، کچھ دیر تازہ ہوا میں سانس لینا چاہتی تھی۔ یا وہ شخص بہت جانا پہچانا سا تھا یا شاید جانا پہچانا اتنا نہیں تھا جتنی اس کی آنکھوں میں دوستی تھی۔ خوش خلقی سے مسکراتی، مانوس سی، دوست آنکھیں...... یا شاید عرصے سے دشمن دنیا کے راستوں پر خوف کے ٹوکرے لادے، وہ اتنی خود ترسی کا شکار ہو گئی تھی کہ جو پہلا شناسا سا چہرہ اسے دکھائی دیا بس اس نے اسی کو اپنا نجات دہندہ مان لیا۔

وہ ہاسٹل کے ڈائننگ ہال میں کتنی دیر سے کھانے کی میز پر بیٹھی پچھتاؤوں سے برسرِ پیکار تھی۔ سب کھانے والے کھانا کھا کر اٹھ چکے تھے۔

سونیا بھی اپنی پسندیدہ اسٹوڈنٹس کے ساتھ، کب کی ہاسٹل واپس جا چکی تھی۔ روزانہ سبرینہ اور اینڈریا بھی ان کے ساتھ ہی نکلا کرتی تھیں۔ رات کے کھانے کے بعد کچھ دیر کالج کے ڈائننگ ہال سے جونیئر اور سینئر ہاسٹل کے درمیان لمبی اندھیری روشوں پر رات کے پھولوں کی خوشبو سونگھتے کچھ دیر چہل قدمی کرنا، اسے تازہ دم کر دیا کرتا تھا۔

لیکن آج سبرینہ چپ چاپ تھی۔ اینڈریا نے اسے کبھی اتنی گہری سوچ میں ڈوبے نہیں دیکھا تھا...... اور ہاسٹل میں رہنے والی ایک خاتون لیکچرر سے طویل بحث میں الجھی، اسی کے اٹھنے کے انتظار میں تھی۔ وہ دیکھ رہی تھی۔ وہ جب سے پارک سے واپس آئی ہے، کسی اہم مسئلے میں گرفتار ہے۔ آخر جب ڈائننگ ہال کا اسٹاف، کھڑکیاں دروازے بند کرنے اور میزیں رات سے پہلے آخری بار چمکانے لگا تو اس سے رہا نہیں گیا۔ خاتون لیکچرر کو رخصت کر کے وہ اس کی طرف آگئی۔

''آج واپسی کا ارادہ نہیں؟'' اس نے نرمی سے پوچھا تھا۔ سبرینہ بغیر ایک لفظ کہے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

''کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے۔''

اس نے اینڈریا ایلیسن کے ساتھ اندھیرے درختوں کے نیچے دور تک خاموشی سے لیٹی طویل روش پر سے گزرتے اپنے آپ کو مخاطب کیا۔

اور کوئی، کوئی وقت اتنا ظالم ہوتا ہے جب انسان وقت کو نہیں، وقت انسان کو گزارتا ہے۔ اس کے ساتھ ایک بار پھر ایسا ہی ہوا تھا۔

''کس قدر اندھیرا ہے۔'' اس نے اینڈریا کو... بڑبڑاتے ہوئے سنا۔

''پتا نہیں کیوں یہاں روشنی کا بندوبست نہیں کرتے، صبح ضرور بات کروں گی آفس میں۔''

اینڈریا نہیں جانتی تھی کہ اس کے لیے اندھیرے کتنی بڑی نعمت ہیں۔ وہ ایسی پناہ گاہوں کی تلاش میں کتنی بار زخمی ہوئی...... اور کس کس طرح......

''وہ تمہارا دوست تھا کوئی؟'' اینڈریا اس سے پارک میں ملنے والے اس اجنبی کے بارے میں سوال نہ کرتی اگر جو اسے شام سے اتنا پریشان نہ دیکھ رہی ہوتی۔

''نہیں۔'' بہت دیر بعد اس کی آواز آئی۔

''دوست تو نہیں تھا۔'' اس نے اینڈریا سے زیادہ خود اپنے آپ کو یقین دلایا۔

اینڈریا نے اپنے کمرے کا رخ کیا تو وہ ہاسٹل کی دوسری منزل پر اپنے کمرے کو جانے والی سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی۔

دوسری منزل کے لمبے برآمدے میں کھلنے والے ترتیب وار کمروں سے، کسی امریکی گلوکارہ کا گیت اس

کے کانوں تک پہنچ رہا تھا۔
وہ اپنے کمرے کے باہر کاریڈور کے نیم روشن کونے میں پڑی کرسی پر ڈھیر ہوگئی۔
''کیا تھا جو آج کا دن کسی بڑے حادثے کے بغیر گزر جاتا۔'' وہ ہاتھ میں ہاتھ ڈالے کندھے سے کندھا ملائے، سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آتی لڑکیوں کو، ایک بے دھیان سی مسکراہٹ کے ساتھ، نظروں کے سامنے سے گزرتا دیکھتے ہوئے سوچ رہی تھی۔
لڑکیاں ڈراما دیکھ کر واپس آرہی تھیں۔ اونچی آواز میں ہیرو پر، ایک ساتھ جان دینے والی اور زندگی سے اپنا حصہ وصول کرتی لڑکیاں، جنہیں یقین تھا کہ ان کے حسین خواب، حقیقت ضرور بنیں گے، انہیں درد میں ڈوبی گلوکارہ وٹنی ہیوسٹن میں کوئی دلچسپی نہیں تھی جو کہہ رہی تھی۔
(''میں نے تم سے زیادتی کی لیکن میرے پیارے، کیا تم دیکھ نہیں سکتے، کیا تم میرے اندر جھانک نہیں سکتے۔'')
اور اس کی آواز سبرینہ کے دل میں، بہت دور تک بہت زور سے کسی ٹھیس کی طرح لگ رہی تھی۔
(''اگر میرے الفاظ بے معنی ہیں تو میرے گیت کی دُھن پر دھیان دو کیونکہ میری محبت وہیں کہیں چھپی ہوئی ہے۔'')
کاش اسے کوئی ٹائم مشین مل سکتی...... وہ وقت کو اتنا پیچھے لے جاسکتی کہ زندگی کی کتاب میں لکھی... بدصورت تحریریں مٹا کر دوبارہ لکھی جاسکتیں۔ وہ کسی اداس، ندیدے بچے کی طرح دونوں ہاتھوں میں چہرہ ٹکائے، اپنے آپ کو بھی اچھی نہیں لگ رہی تھی۔
لیکن افسوس کہ ایسا ہوتا نہیں...... زندگی ایک منہ بند غار ہے، جس میں صرف ایک ہی راستے پر آگے بڑھا جاسکتا ہے۔ پیچھے پلٹ کر جانے کا کوئی راستہ نہیں ہوتا۔
وہ ایک، ایک کمرے میں جھانکتی، لڑکیوں کی گنتی پوری کرکے حاضری لگاتی، ٹھیک رات دس بجے جونیئر ہاسٹل کے تمام کمروں کی بتیاں بجھوا کر لڑکیوں کو سو

جانے کی ہدایت کرتی...... اپنے روزگار کے تمام فرائض ایمانداری سے انجام دے کر اپنے بستر پر آگئی۔
شام سے اب تک ملامت، پچھتاوے اور افسوس کے کتنے ہی دور، اس پر سے گزرتے رہے تھے لیکن تکیے پر سر رکھتے ہی ایک زبردست خوف اس پر حملہ آور ہوا۔
یہ ستمبر کی ابتدائی راتیں تھیں۔ گرمی بہت زیادہ نہیں تھی۔ یا شاید اسے ہی اچھے برے موسم گزارنے کی عادت ہوگئی تھی...... لیکن اینڈریا بہت تکلیف میں تھی۔ وہ امریکا کی سرد ترین ریاست مینیسوٹا سے آئی تھی۔ اسے اس قیامت کی گرمی میں اپنے کمرے کے پوری رفتار سے چلتے پنکھے میں بھی نیند نہیں آرہی تھی۔ اپنی طرف کے کمروں کی چھت پر مچھر دانی لگا کر سونے کا آئیڈیا بھی اینڈریا کا ہی تھا...... اسی نے سبرینہ کو بتایا تھا کہ اس ملک میں، گرمی کے موسم میں چھت پر سونا ایک عام سی بات ہے۔ سبرینہ نے اینڈریا کو یہ بتا کر مایوس نہیں کیا کہ اس ملک پاکستان سے وہ اس سے کچھ زیادہ ہی اچھی طرح واقف ہے۔ سخت گرمیاں شروع ہونے کے بعد سے وہ اور اینڈریا چھت پر سو رہی تھیں۔
ستاروں بھرے آسمان سے اس کی دوستی بھی خوب ہوگئی تھی۔
آسمان جو ایک مہربان سامع تھا۔ ساری شکایتیں، سارے سوال خاموشی سے سنتا تھا۔ مگر آج ایک غیر معمولی رات تھی۔
اسے آسمان کی تاریکی سے، ایک کوبرا سانپ اپنی طرف لپکتا نظر آیا۔
''اگر فاروق کو سچ مچ پتا چل گیا تو......؟'' اسے لگا، رات بہت کالی ہے، چندا بھی نہیں نکلا تھا...... لیکن ستارے چمکتے، چمکتے تھک کر سو بھی گئے تھے۔ جگمگانے اور چمکنے کا یہ کھیل جیسے ان کے لیے کوئی ناپسندیدہ سا فعل بن کر رہ گیا ہو۔
''تم اس بھول میں مت رہنا کہ تم کہیں بھاگ کر جا بھی سکتی ہو۔''
کسی کی خون جما دینے والی سفاکانہ سرگوشی اس

کے کان میں گونجی تھی۔
"میں زیادہ نہیں کہنا چاہتا...... مگر مجھے آزمانے کی غلطی مت کرنا...... اب تک تمہیں شاید ٹھیک سے اندازہ نہیں ہوا۔"
اسے ٹھیک سے اندازہ ہو چکا تھا۔ اس نے محسوس کیا، اس کی کنپٹی سے ہو کر کان اور بالوں میں جذب ہوتے ٹھنڈے پسینے کے قطرے، گرمی سے نہیں، خوف کی زیادتی سے بہہ نکلے تھے۔
اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ اتنے مضبوط اعصاب کی مالک نہیں۔ وہ ہولے ہولے کانپ رہی تھی۔
اس خوفناک اکیلی رات میں، اس کے ساتھ کوئی بھی بڑا حادثہ پیش آسکتا ہے۔ شاید وہ کل کا سورج دیکھنے کے لیے نہ بچ سکے۔ اور اگر اگلی تمام عمر اس کے نام، ایک بے رحم قاتل کے خنجر تیز کرنے کی مشقت لکھ دی گئی...... تو وہ اس خون آلود سرخ جہنم میں کیسے جل سکے گی۔ کتنی دیر تک خوف کی شدید لہر اس کی ریڑھ کی ہڈی کو سنسناتی گزرتی رہی۔ کتنی دفعہ اس نے سوچا کہ وہ آواز دے کر ساتھ کی چارپائی پر سوئی اینڈریا کو جگا لے۔ لیکن اسے لگا اگر اس نے ذرا سی آواز اونچی نکالی تو چھت کے کسی اندھیرے کونے سے، برآمدے کے کسی ستون کے پیچھے سے نکل کر کوئی ڈراؤنا ہیولہ اسے دبوچ لے گا۔
پتا نہیں کتنی رات گزر چکی تھی اور کتنی ابھی گزرنا باقی تھی۔
شاید اسے تھوڑی سی نیند آگئی تھی کہ سناٹے میں ایک ارتعاش پیدا ہوا۔ جیسے کوئی وزنی چیز دھم سے گری ہو۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھی...... اس کا دل اچھل کر حلق میں دھڑک رہا تھا۔
ایسی آوازیں صرف وہم سے نہیں آیا کرتیں مگر کاش یہ اس کا وہم ہی ہو۔ کتنی دیر سانس روکے پڑے رہنے کے بعد اسے لگا وہ خوفناک سا اسرار، وہ بھیانک سرسراہٹ، اس کے اردگرد کی فضا سے معدوم ہو گئی ہے۔
اس کے دل کی دھڑکن ابھی معمول پر نہیں آئی تھی پھر بھی وہ اٹھ بیٹھی۔ چاروں طرف غضب کا سکون اور اطمینان تھا۔ رات اپنے دامن میں بے شمار لوگوں کے خواب سمیٹے دھیرے دھیرے گزر رہی تھی۔ دور بہت دور ہاسٹل کی باؤنڈری وال کے اُدھر لمبی اور ویران سڑک خاموشی سے لیٹی رات کے مسافروں کو راستہ دکھا رہی تھی۔ سڑک پر سے گزرنے والی گاڑیوں کی ہیڈ لائٹس ذرا دیر کو ہاسٹل کی پچھلی دیوار پر لہراتیں پھر دور ہوتے ہوتے بالکل معدوم ہو جاتیں۔
گاڑیوں کے وقتاً فوقتاً بجتے ہارن، کسی بے قابو کار کے چرچراتے ٹائر، چند لمحوں کو فضا کے جامد سناٹے کو منتشر کرتے...... پھر گزر جاتے۔
یہ دوسری ہزاروں راتوں جیسی ایک عام سی رات تھی۔ جس میں کوئی غیر معمولی پن نہیں تھا۔ کائنات کی ہر حرکت پُرسکون تھی۔ سوائے ہاسٹل کی چھت پر سانس روکے بیٹھی اس لڑکی کے جسے ایک معصوم بلی نے انجانے میں کود کر بے سکون کر دیا تھا۔ وہ پوری چھت پر ٹہل کر، یہاں وہاں سے نیچے جھانک کر اچھی طرح اطمینان کر کے بستر پر واپس آئی تو بھی اسے یقین نہیں تھا کہ اس کا خوف بے بنیاد ہے۔
صبح ہونے میں چند گھنٹے باقی تھے۔ وہ مؤذن کی آواز کو مہربان ماں کی لوری کی طرح سنتی، کب سوئی، اسے پتا نہیں چلا۔ ایسی ہی ایک اور لمبی رات کو، اس نے اپنے خدا کے بالکل نزدیک جا کر ایک دعا پہلے بھی مانگی تھی۔ وہ بند آنکھوں سے اپنے آپ کو اسی رات کی اذیت میں مبتلا دیکھ رہی تھی۔
اسے لگا، اسے سوئے ابھی کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ کسی نے اسے بری طرح جھنجوڑ دیا۔
اس نے بہ مشکل تمام کھلتی، بند ہوتی آنکھوں سے دیکھا، اینڈریا اس سے کچھ کہہ رہی تھی پر کیا......؟ وہ سمجھ نہیں سکی...... وہ ایک خواب میں مسلسل جاگ رہی تھی...... کتوں کے بھونکنے کی آوازیں اس کے قریب پہنچ چکی تھیں...... اس کی سانس اکھڑ رہی تھی۔ اس کے پاؤں زخمی تھے مگر وہ رک نہیں سکتی تھی...... وہ بھاگے چلی

جا رہی تھی۔ اسے ڈیڈی کے پاس جانا تھا...... اسے ایما کے پاس جانا تھا مگر کتے اس کے تعاقب میں تھے...... اس کی بوٹیاں نوچنے کو بے قرار...... سرخ لپکتی زبانوں والے...... اس کی آنکھ کھلی تو تیز چمکیلی دھوپ اس کے اوپر تک آ رہی تھی۔

وہ بستر سمیٹ کر نیچے آئی تو ہاسٹل کی خاموشی بتا رہی تھی کہ پڑھنے والے پڑھائی کرنے جا چکے تھے۔ اس نے منہ ہاتھ دھونے کے دوران واش بیسن کے آئینے میں نظر ڈالی۔ کیا رات بھر کی کہانی اس کے چہرے پر صاف پڑھی جا سکتی تھی؟ وہ اپنا پہلا پیریڈ مس کر چکی تھی۔ کالج کی پرنسپل اچھی خاتون تھیں لیکن انہیں شکایت کا موقع دینا اچھی بات نہیں تھی۔ وہ ان کی احسان مند تھی کہ انہوں نے اسے بغیر کسی حوالے اور دستاویزی لوازمات کے، اس اجنبی ملک میں روزگار اور چھت کا آسرا دیا تھا۔ اس نے پرنسپل کے کمرے میں اپنی طبیعت کی خرابی کو تاخیر کا سبب بنا کر پیش کرنا چاہا...... اسے پتا چلا اینڈریا ایلیسن اس کی دوست یہ کام پہلے ہی کر چکی تھی۔

''ہم بلاوجہ ہی دنیا سے بدگمان رہتے ہیں...... کتنے اچھے لوگ اسی دنیا میں روزانہ ہمیں ملتے ہیں اور ہمیں احساس تک نہیں ہونے دیتے۔''

اس نے بہت شکر گزاری سے اینڈریا کے بارے میں سوچا۔ یہ کل سے اب تک ہونے والا سب سے اچھا واقعہ تھا۔

اینڈریا اسے پرنسپل کے کمرے سے نکلتے ہی ملی۔ وہ سونیا بروس کی کوئی بات توجہ سے سنتی اسی طرف آ رہی تھی۔ اسے دیکھ کر دور ہی سے بولی۔

''میں نے پرنسپل کو بتا دیا تھا کہ آج تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں، تم کوئی کلاس نہیں لو گی۔'' اسے خیال آیا...... رات جب وہ خوفزدہ بلی بنی...... چھت پر یہاں وہاں گھوم رہی تھی تو اینڈریا نے ایک بار بھی آنکھ کھول کر نہیں دیکھا تھا۔

''کیا وہ دوسروں کی بے چینی، سوتے میں بھی بھانپ لینے پر قادر ہے؟'' سبرینہ کو یہ بات زیادہ مناسب معلوم نہیں ہوئی۔

''نہیں، میں ٹھیک ہوں۔''

اینڈریا کو لگا، وہ کسی بات کا برا مان گئی ہے......

وہ سونیا کے ہاتھ میں دبی، اپنی کہنی ہٹا کر اس کے نزدیک آئی۔

''مجھے لگا، تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔''

سبرینہ کو اچھا نہیں لگا، جیسے وہ اس کے چہرے پر کسی سوال کا جواب تلاش کر رہی تھی۔

''تم رات بھر بے چین رہیں، میری آنکھ کھلی تو تم چھت پر ٹہل رہی تھیں۔ تم کچھ پریشان ہو سبرینہ......؟ تم مجھ سے ہر بات کر سکتی ہو۔'' وہ اس کے بالکل نزدیک کھڑی، اتنی فکرمندی سے پوچھ رہی تھی کہ سبرینہ نے گرمجوشی کی ایک زبردست لہر اپنے دل میں اٹھتی محسوس کی۔

''نہیں، ایسی کوئی بات نہیں......'' وہ اپنی تھرڈ ائیر کی کلاس لینے جا چکی تھی۔

اینڈریا کو لگا...... وہ کوئی فاصلہ کم کرنے کو تیار نہیں، وہ کسی پر اعتبار کرنے کو تیار نہیں ہے، وہ خود اپنے مسکرانے سے خوفزدہ ہے...... حتیٰ کہ اب وہ کسی سے بات کرنے سے بھی خوفزدہ ہے حالانکہ سب کی رائے سبرینہ گیبرئیل کے بارے میں یہ نہیں تھی۔ یہیں اسی کالج میں، کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ وہ حسین، مغرور اور لیے دیے رہنے والی نئی لیکچرر، کسی کو اپنے برابر کا نہیں سمجھتی...... لیکن اینڈریا ایلیسین جانتی تھی کہ ایسا نہیں ہے۔

ابھی زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ اس نے اینڈریا کو ہونے والے زبردست ملیریا بخار میں، دن رات ایک کر کے اس کی دیکھ بھال کی تھی۔ کسی معمولی اکتاہٹ کے اظہار کے بغیر اسے تازہ سوپ اور پلین دلیا کھلاتی، اس کا دھیان رکھتی وہ لڑکی، اینڈریا کو لوگوں کے ہر اندازے کو غلط ثابت کرتی بہت اچھی لگی تھی۔

☆☆☆

اپنی عمر کی چوتھی دہائی پھلانگ چکنے والی سونیا کا تعلق آسٹریلیا سے تھا۔ وہ ہاسٹل کی حالیہ چند سالہ تاریخ

کی سب سے پرانی غیر ملکی وارڈن تھی۔ اسے خود کو کم عمر اور پُر اعتماد ظاہر کرنے کا شوق تھا۔ اسے لوگوں پر ہنسنا اور بے لاگ تبصرے کرنا بھی پسند تھا۔ اس سے انسان زیادہ پُر اعتماد دکھائی دیتا ہے اور نہ جانے کیوں، اسے سبرینہ سے ایک عجیب چڑ تھی اور وہ ہاسٹل کی دیگر وارڈنز کو، اپنے خیالات سے آگاہ کرنے میں کوئی حرج بھی نہیں سمجھتی تھی۔

اسے یقین تھا کہ سبرینہ کو اپنے حسن پر سخت غرور ہے، تبھی وہ کسی سے گھلتی ملتی نہیں..... کوئی اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔

''وہ اتنی کم عمر نہیں، جتنی لگتی ہے۔'' اور.....

''پتا نہیں، اس نے بیچلرز بھی کیا ہے یا نہیں..... یہ تو مسز احمد ہی اتنی سادہ ہیں کہ اسے یہاں جاب مل گئی۔''

اینڈریا کو سونیا بروس سے سخت اختلاف تھا..... لیکن وہ دیکھتی تھی کہ سبرینہ کے لیے، سونیا جیسی عورت جیسے کوئی وجود ہی نہیں رکھتی تھی اور صرف سونیا ہی نہیں، اسے اپنے اردگرد کی دنیا میں کسی سے کوئی زیادہ مطلب نہیں تھا۔ سبرینہ کے لیے اتنا کافی تھا کہ کالج کی نیک دل پرنسپل نے، اس کی استعداد کو، ایک ہی ملاقات میں جانچ کر اسے زندگی نئے سرے سے شروع کرنے کا موقع دیا تھا۔

چونکہ وہ پچھلے کئی مہینوں سے ہاسٹل میں ہی رہ رہی تھی، اسے جونیئر ہاسٹل کی وارڈن کی جزوی ذمے داری دینا، ان کے لیے زیادہ مشکل ثابت نہیں ہوا۔ انہیں انسانوں کی پرکھ کا دعویٰ تھا اب تک جو غلط ثابت نہیں ہوا تھا۔

وہ پڑھاتی کیسا تھی، اس کا اندازہ انہیں تھرڈ ائیر اکنامکس کی طالبات کے امتحانی نتائج دیکھ کر ہو چکا تھا۔ وہ جس بھی وجہ سے یہاں تھی کسی کو نقصان پہنچانے نہیں آئی تھی۔ پرنسپل یہ اندازہ بھی لگا سکتی تھیں کہ وہ زیادہ دیر شاید یہاں نہ رکے مگر جب تک یہاں ہے تب تک کالج کو اس کی قابلیت سے فائدہ اٹھا لینا چاہیے۔

اس کے دو ہی شوق تھے..... کتابیں پڑھنا.....

اپنی نوٹ بک میں کچھ لکھتے رہنا..... اور کالج کی ایک سینئر پروفیسر مس تزئین اظہر سے ملنے ہاسٹل ہی میں موجود ان کی رہائش گاہ ''اسٹاف ہاؤس'' جانا۔ اسے بحث کرنے میں دلچسپی نہیں تھی..... لیکن مس اظہر کی باتیں اسے اچھی لگتی تھی۔

تزئین اظہر تاریخ پڑھاتی تھیں۔ جنوبی ایشیا اور اسلامی دنیا کی تاریخ..... جو اُن کے بقول، کبھی ترقی معکوس کا باب معلوم ہوتی ہے..... کبھی درباریوں کی خوشامد اور کبھی مستقبل میں جھانک سکنے والا جادوگرنی کا کرسٹل بال..... انہیں یقین تھا کہ تاریخ کو درست طریقے سے لکھا گیا ہوتا تو دنیا اس سے حقیقتاً کچھ سبق سیکھ سکتی تھی۔ جو تاریخ کتابوں میں درج ہے، اس میں سچ اور جھوٹ کی تمیز کرنا اتنا ہی مشکل ہے جتنا ریت سے سونا الگ کرنا۔

تاریخ سبرینہ کا مضمون نہیں تھا مگر اس ملک کی تاریخ کا اُس ملک سے بہت گہرا تعلق تھا، جہاں سے وہ آئی تھی۔

کالج کے ساتھ تزئین اظہر کا بہت دیرینہ تعلق تھا..... دہرہ دون میں بچپن گزارنے والی تزئین اظہر تقسیم ہندوستان سے پہلے بننے والے اس تاریخی کالج کے ابتدائی سالوں کی فارغ التحصیل طالبات میں سے تھیں۔

''پاکستان بنانے والوں نے کیا سوچ کر ایک الگ ملک مانگا تھا؟''

''بعد میں آنے والوں نے اسے کیا بنا دیا؟''

سن سینتالیس میں، پاکستان بننے کے بعد، مسلمان گھرانوں کی جو گنی چنی لڑکیاں کالج کی تعلیم حاصل کر رہی تھیں اور جو تزئین اظہر کے بقول، ساڑی پہن کر سائیکل چلا لیا کرتی تھیں، بہت بہادر اور ترقی پسند لڑکیاں تھیں..... وہ ایسی لڑکیاں، اس نئے ملک کی تعمیر کے لیے، کس قدر قیمتی رہی ہوں گی۔'' وہ پاکستان کی تاریخ کے تمام اندرونی ابواب سے واقف نہ ہو کر بھی بخوبی اندازہ لگا سکتی تھی۔

اس ملک اور اس میں رہنے والوں کو بہت عجیب انداز سے بہت قریب سے دیکھ لینے کے باوجود وہ ان تمام اچھی باتوں پر بھروسا کرنا چاہتی تھی۔ مسز تزئین اظہر جو اپنے گھنگریالے، سرمئی بالوں میں ہاتھوں سے کنگھی کرتیں...... وہ اس ملک میں اب تک اسے ملنے والی سب سے متاثر کن شخصیت تھیں۔ وہ اسے کالج کی عظمتِ رفتہ کے قصے سناتیں۔ مسز منجلا کماری اور مسز رحیم الدین کے زمانے کی سنہری یادیں تازہ کرتیں...... تعلیم حاصل کرنے کے لیے، اپنے زمانے کی طالبات کی زبردست لگن اور مشکلات کا ذکر کرتیں...... لیکن جو بات انہیں اپنی عمر کے دیگر لوگوں سے ممتاز کرتی تھی، وہ مستقبل سے مایوس نہیں تھیں۔ سبرینہ ان کی مثبت سوچ اور امید بھرے الفاظ کو سنتی حیران ہوتی رہتی...... ان کی باتوں میں، ان کے خیالات میں کہیں بھی وہ پیرانہ سالی، وہ عمر رسیدگی نہیں تھی جو اُن کی دوہری ہوتی کمر اور چہرے اور ہاتھوں کی جھریوں میں نمایاں طور پر جھلکتی تھی۔

سبرینہ سمجھ سکتی تھی...... وہ لڑکیاں کتنی خوش قسمت رہی ہوں گی جنہیں ان سے پڑھنے کا موقع ملتا رہا تھا۔ ہاں لیکن...... آج کے دن اس کے لیے دنیا کی ہر دلچسپی اپنی کشش کھو بیٹھی تھی۔

اس نے اس بھیانک کالی رات کی کسی گھڑی میں، خدا کے بالکل نزدیک جا کر دعا مانگی تھی اور وہ قبول بھی ہوگئی تھی لیکن وہ جانتی نہیں تھی کہ رات سے صبح کرے گی تو دن سے رات کرنا عذاب ہو جائے گا۔

یہ ایک گھنٹا گزرا ہے اب دوسرا گھنٹا گزر رہا ہے، ابھی تین گھنٹے بھی نہیں ہوئے۔ وقت جیسے کسی اڑیل ضدی گھوڑے کی طرح راستے کے بیچ رک گیا تھا اور چابک برسانے پر اور زیادہ اکڑفوں دکھانے لگتا...... وہ تمام دن گھڑی کی سوئیوں پر نظریں جمائے نامعلوم جلاد آہٹوں کی منتظر رہی تھی۔

اور اب پھر...... ایک سیاہ رات اس کے کمرے کے دروازے کے باہر سوال بن کر کھڑی تھی...... کاش اس نے لمحوں کے بجائے عمر بھر کے لیے خدا سے اپنے

قائدِ اعظم کی عظمت

قیامِ پاکستان کے بعد ایک غیر ملکی صحافی نے قائدِاعظم سے کہا۔ ''آپ کتنے خوش نصیب ہیں آپ نے اپنی قوم کے لیے ایک الگ ملک حاصل کرلیا آپ بانیِ پاکستان ہیں۔'' قائدِاعظم نے جواب دیا۔ ''میں اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ پاکستان میری زندگی میں بن گیا لیکن میں بانیِ پاکستان نہیں ہوں۔'' صحافی نے تعجب کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا۔ ''اگر آپ اس مملکت کے بانی نہیں تو پھر کون ہے؟'' قائدِاعظم نے جواب دیا۔ ''ہر ایک مسلمان۔'' یہ سن کر صحافی بہت حیران اور مرعوب ہوا۔

مرسلہ: رفعت مبین رفی، یو ایس اے

تحفظ کی ضمانت مانگی ہوتی۔

اس رات وہ ضد کر کے اپنے کمرے میں سوئی، کھڑکیاں دروازے اچھی طرح بند کیے حالانکہ وہ جانتی تھی جس خوفناک گھڑی کے آنے کا اسے ڈر ہے اس نے اگر سچ آنے کا ارادہ کرلیا تو یہ تالے، یہ چٹخنیاں کسی کام نہیں آئیں گی۔ وہ سائیڈ ٹیبل کا لیمپ جلا کر بستر پر آگئی اور چھت کے گھومتے پنکھے کو گھورتے ہوئے پچھلے اٹھائیس گھنٹوں کے اٹھائیس کروڑ لمحوں میں اٹھائیس ارب دفعہ گزرنے والے اسی بھیانک خوف کو اپنے اوپر سرسراتا محسوس کرنے لگی، جس نے کل سے اس کا خون خشک کیے رکھا تھا اور یہ جان کر اسے مایوسی ہوئی کہ وہ بالکل بھی بہادر نہیں ہے۔

وہ اور ہوتے ہیں جو سکون سے خود اپنے ڈوبتے، ڈوبتے رہنے کا نظارہ کرتے ہیں، آہستہ...... آہستہ...... آہستہ اور آہستہ...... بہت بہادر اور بہت ہی عالی حوصلہ...... وہ مگر اتنا۔ اتنا سارا حوصلہ کہاں سے لائے لیکن وہ رات کوئی انہونی کیے بغیر گزر گئی تھی اور اس سے اگلی رات اور اس سے اگلی والی بھی...... اصولاً

تو اسے سکون کی سانس لینی چاہیے تھی مگر وہ اور بھی بے سکون ہوگئی۔ تمام دن وہ جلے پیر کی بلی کی طرح صبح سے دوپہر تک کلاسیں بدلتی پھرتی اور اسے لگتا، وہ منحوس گھڑی نہایت سفاکی سے دور بیٹھی اس کا تماشا دیکھ رہی ہے۔ خوش فہمیاں پالنے کی اسے عادت نہیں رہی تھی۔ پھر اسے غصہ آنے لگتا...... جس برے وقت کو آنا ہے آخر وہ آکیوں نہیں جاتا۔ اسے کس چیز کا انتظار ہے؟ کبھی وہ سوچتی...... کیوں نہیں وہ یہ ساری بزدلی چھوڑ کر بھاگ کھڑی ہوتی؟ اس اتنی بڑی دنیا میں کیا اسے چھپنے کے لیے ایک ننھا سا کونا بھی دستیاب نہیں ہوگا؟

اور سوچنے کی بات یہ بھی تھی یہ خیال پہلے کبھی اتنی شدت سے کیوں نہیں آیا؟ پھر وسوسے اس کا راستہ گم کرنے لگتے، اسے فرار کی ہر کوشش بے فائدہ لگنے لگتی۔ اسے شک تھا...... فاروق شاید کسی زیرک شکاری کی طرح اونچی مچان پر بیٹھ کر شکار کے دام میں آنے سے پہلے کی بوکھلاہٹ کا مزہ لے رہا ہے اور اسے یقین ہو کہ شکار چاہے کتنا ہی تیز دوڑے...... کتنا ہی آگے نکل جائے...... وہ رسی کا حقیر پھندا پھینک کر اسے پل میں قابو کرلے گا۔

☆☆☆

''May I come in Ma,m?''

کسی نے جالی کے دروازے سے ناک چپکا کر اسے پکارا تھا۔ وہ ابھی اپنے دھلے ہوئے کپڑے برآمدے میں تنی رسی پر پھیلا کر کمرے میں آئی ہی تھی۔ اس نے گھوم کر دیکھا اور گردن کی ہلکی سی جنبش سے لڑکی کو اندر آنے کا راستہ دیا۔

وہ اس دفعہ کے بیچ کی ہاسٹل آنے والی ان دو نئی طالبات میں سے ایک تھی۔ جن کی انگریزی بولنے سے جان جاتی تھی۔ وہ جب بھی آتی، اپنا کوئی نہ کوئی مترجم ساتھ لاتی تھی۔ وہ لاہور کے کسی نواحی علاقے سے آئی تھی اور آمدورفت کا کوئی ذریعہ نہ ہونے یا شاید کسی اور مسئلے کی وجہ سے ہاسٹل میں رہنے پر مجبور ہوئی تھی۔ مگر جس دن سے آئی تھی ہاسٹل اس کے لیے عذاب بنا ہوا تھا۔

شاید وہ اپنے گھر والوں سے اتنی قریب تھی کہ ہاسٹل کی زندگی سے سمجھوتا نہیں کر پا رہی تھی۔ سبرینہ جب بھی اسے دیکھتی، اس کی آنکھیں روئی روئی اور چہرہ سرخ ہو رہا ہوتا۔ وہ جتنا چاہتی تھی کہ اس کا وارڈن سے واسطہ نہ پڑے، اتنا ہی اس کے کام سبرینہ کے پاس اٹکے رہتے تھے۔ وہ ہر بار کسی ساتھی طالبہ کو ساتھ لے کر آتی تھی۔ اس کے کان میں وہ اپنا مسئلہ بتاتی اور ساتھی طالبہ مستعدی سے انگریزی ترجمہ اگلنے لگتی۔

''میم یہ کہہ رہی ہے، اس کے ہاسٹل کے بلیو کارڈ پر اس کے بھائی کے دستخط ہونے رہ گئے ہیں...... اب یہ ویک اینڈ پر گھر کیسے جائے گی؟ اسے ہاسٹل سے گھر لے جانے کے لیے صرف اس کا بھائی ہی آسکتا ہے۔'' وہ تھوڑی دیر رک کر پھر بولی۔

''میم...... اسے اپنے فزیکل ایجوکیشن کے یونیفارم کے لیے اپنے گھر فون کرنا ہے، کیا آپ اسے ساتھ لے جا کر کالج کے باہر کہیں سے فون کروا دیں گی؟ آج اسے یونیفارم نہ ہونے کی وجہ سے جرمانہ ہوا ہے۔ دراصل کالج سے فون نہیں ہوسکتا، مسٹر چوہدری کے پاس فون کے ٹوکن ختم ہوگئے ہیں۔'' وہ دونوں لڑکیوں کے پیغامات سنتی، مسئلے حل کرتی رہتی...... اس نے کبھی یہ بتانا ضروری نہیں سمجھا کہ اسے لڑکی کی کوئی بات سمجھنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آرہی۔

اس نے دیکھا آج وہ اکیلی آئی تھی۔

لڑکی اس کے اشارے پر کرسی سنبھالتے محتاط انگریزی میں بولی۔

سبرینہ نے اپنی کرسی سنبھال لی پھر میز پر رکھے کاغذات کی ترتیب درست کرتے ہوئے بڑے غور سے اسے دیکھا۔ وہ گھبرائی ہوئی نہیں لگ رہی تھی جیسے آج اپنے سارے مسئلے خود ہی حل کرنے کا تہیہ کر کے آئی ہو۔ ہمیشہ کی روئی روئی آنکھیں بھی آج کچھ روشن روشن سی تھیں۔

اس نے کارڈز کے ڈھیر کے نیچے سے اپنا مطلوبہ کاغذ تلاش کر کے سیدھا کیا۔

''میں نے یہ پوچھنے کے لیے تمہیں بلایا ہے کہ

مجھے سمجھ نہیں آئی، یہ کیا ہے؟'' اس نے ایک کاغذ اس کے سامنے لہرایا۔

لڑکی ذرا سا ہچکچائی...... جیسے کچھ غلط کہنے سے ڈرتی ہو۔ پھر بولی۔

''دراصل میم...... میں اپنے گھر واپس جانا چاہتی ہوں۔''

''کیا تم جانتی ہو......؟'' سبرینہ نے اسے سمجھانا چاہا۔ ''ایک بار تم نے ہاسٹل چھوڑ دیا تو تمہیں دوبارہ یہاں جگہ نہیں مل سکے گی۔ کیا مسئلہ ہے تمہیں یہاں...... مجھے بتاؤ؟''

لڑکی نے اپنے ہاتھ مسلے اور سبرینہ کو محنت سے یہ سمجھانے کی کوشش کرنے لگی کہ وہ ہاسٹل کی زندگی سے مر کر بھی خود کو ہم آہنگ نہیں کر پائے گی۔

''وہی تو میں جاننے کی کوشش کر رہی ہوں کہ کیوں......؟'' اسے لگا وہ خواہ مخواہ ہی بحث کر رہی ہے۔

''تم اپنا مسئلہ سمجھاؤ گی نہیں تو ہم اسے کیسے حل کریں گے۔'' لڑکی کچھ دیر سر جھکائے رہی پھر بالکل صاف انگریزی میں بولی تھی۔

''میں آپ کو سمجھا نہیں سکتی میم، یہ بہت عجیب سی بات ہے، دراصل میں اپنے گھر سے دور نہیں رہ سکتی۔''

''اور یہ تو میں سمجھنے کی کوشش کر رہی ہوں کہ کیوں؟''

سبرینہ کی آواز بلند نہیں ہوئی تھی مگر لڑکی سمجھ گئی تھی کہ میم اب غصے میں آ رہی ہیں۔ اس کے بالوں کی چھوٹی چھوٹی لٹیں چھت کے گھومتے پنکھے کی آزمائش سے بے قابو ہو رہی تھیں۔ پھر اس نے لڑکی کو پہلے سے قدرے کمزور انداز میں وضاحت کرتے سنا۔

''دیکھیں...... میم! میں رات دس بجے کے بعد اپنی پڑھائی شروع کرتی ہوں اور یہاں رات دس بجے ساری لائٹس آف کر دی جاتی ہیں...... اور مجھے کسی کے ساتھ ایک کمرے میں رہنے کی عادت نہیں ہے۔'' وہ بتاتی جا رہی تھی۔

''ہاسٹل کا ماحول میرے گھر سے مختلف ہے... اور...... میں اپنے گھر کے بغیر جی ہی نہیں سکتی۔''

وہ رک رک کر یہاں نہ رہنے کے سبب بتاتی چلی گئی۔

سبرینہ نے اپنے سامنے میز پر رکھا رجسٹر بے سبب ہی کھولا تھا۔ پتا نہیں کیوں...... اسے شبہ ہوا وہ لڑکی اسے چڑانے کی کوشش کر رہی ہے۔

''میں اپنے گھر کے بغیر نہیں رہ سکتی، گھر...... ہونہہ۔''

لیکن لڑکی حیران رہ گئی تھی۔ میم سبرینہ نے اگلا فقرہ زبردست اردو میں ادا کر کے دھماکا کر دیا تھا۔

''ہاں لیکن اپنے مستقبل کے لیے اپنی پڑھائی کے لیے ایسی چھوٹی چھوٹی قربانیاں تو دینی پڑتی ہیں۔''

لڑکی منہ کھول کر حیرت کا بہ آواز اظہار کرنے کے بجائے اچانک ہی خوش ہو گئی تھی۔

سبرینہ نے خود کو اس کے چہرے پر پھیلنے والی روشنی سے اور بھی چڑتے ہوئے محسوس کیا۔ اب وہ اسے ہاسٹل قوانین کے جن دکھا، دکھا کر ڈرا رہی تھی۔

''تم نے تین دن پہلے سے اطلاع نہیں دی تھی کہ تم ہفتے کے درمیان میں ہاسٹل سے گھر جانا چاہتی ہو۔ ہاسٹل کے قوانین میں نے نہیں بنائے۔ جس نے بنائے ہیں ان کے پاس جا کر اعتراض کرو۔'' وہ چڑ کر بولی تھی۔

''اگر ہاسٹل کی رولز بک تم نے نہیں پڑھی تو میرا کیا قصور......؟'' وہ ٹپ ٹپ آنسو بہاتی لڑکی، وضاحتیں کرتی ہلکان ہو رہی تھی۔ وہ فوری طور پر اپنے گھر اس لیے جانا چاہتی تھی کہ صرف چند دن کے لیے خود گھر سے روز کالج آ کر دیکھ سکے، آیا وہ تنہا پبلک ٹرانسپورٹ میں سفر کر سکتی ہے یا نہیں، اس کے بعد وہ ہاسٹل سرے سے ہی چھوڑ دے گی۔

مگر سبرینہ کسی بدمزاج ہیڈ مسٹریس کی طرح ''نہ'' ''نہ'' کرتی کچھ بھی سننے پر آمادہ نہیں تھی۔

آخر لڑکی تھک کر چپ ہو گئی۔ اب وہ ہاتھ کی پوروں سے اپنے آنسو صاف کر رہی تھی۔ سبرینہ کا دل افسوس سے بھر گیا...... اتنی معصوم سی لڑکی کو رُلا کر وہ دراصل کس چیز کا بدلہ، کس سے لینا چاہتی ہے۔ پھر وہ چھوٹی سی لڑکی یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ جتنی ضدی سی

بن کر میم سبرینہ اتنی دیر سے مسلسل انکار کیے جا رہی تھیں...... اتنے ہی آرام سے وہ مان بھی گئیں۔ انہوں نے اسے گھر جانے کی اجازت دینے کے ساتھ، ساتھ اچھی سی مزیدار سی کافی بھی بنا کر پلائی تھی۔

☆☆☆

وہ بد مزاج بوڑھیوں کی طرح ہر ایک سے الجھنے لگی تھی۔ صبح سے دوپہر تک پیریڈ کی گھنٹیوں کے تعاقب میں، ایک سے دوسرے کلاس روم میں جانا، اسے مشکل ہو رہا تھا۔ وہ ان دنوں اپنی اسٹوڈنٹس کو کیا پڑھا رہی تھی اگر اتنی الجھی ہوئی نہ ہوتی تو اپنا محاسبہ ضرور کرتی۔

اور وہ ایسا ہی اکتاہٹ بھرا دن تھا جس میں سونیا بروس سے اس کی جھڑپ ہوتے ہوتے بچی...... اینڈریا اس کے عجیب وغریب موڈ سے تنگ آ کر لڑ پڑی تھی اور اس اداس سی روئی روئی آنکھوں والی لڑکی کو چڑیا کی طرح چہچہاتے، اپنی ماں کے ساتھ ہاسٹل سے رخصت کرتے، اس کی آنکھیں خواہ مخواہ گرم پانیوں سے بھر رہی تھیں۔ اس نے شدید رشک سے اپنی ماں اور بھائی کے ساتھ اپنے محبوب گھر کو روانہ ہونے والی شاد مان و فرحاں لڑکی کو دیکھا۔ جس نے زمانے کی مشکلات پر لعنت بھیج کر، اپنے گھر اور اس میں رہنے والوں کو اپنے لیے چن لیا تھا۔

لیکن اسے پتا نہیں، اتنی تکلیف کس بات پر ہو رہی تھی۔ وہ ساری شام قیمتی گاڑیوں میں آنے والے والدین اور ہاسٹل میں رہنے والی بیٹیوں کی ملاقات کے مناظر دیکھ دیکھ کر کڑھتی رہی...... اور سب سے زیادہ تکلیف اسے تب ہوئی، جب وہ لمبا سفر کر کے آنے والوں کے گلے میں جھولتی، خوشی سے چلاتی، کالج کے قصے سناتی، ہاسٹل کی کم عمر طالبات کو دیکھ کر حسد محسوس کر رہی تھی۔ محبت اور فکر کا اظہار کرتے، حال چال پوچھتے، کالج کی سرگرمیوں کی روداد سنتے والدین...... ہنستے کھلکھلاتے بہن بھائی...... کچھ ماڈرن کچھ دیہاتی، درمیانی عمر کی مائیں...... سوٹ بوٹ والے، شلوار قمیص والے باپ...... سب کے معاشی درجے، اس ملک کی اس کلاس کے نمائندگی کرتے تھے، جن کا بڑا حصہ تزئین اظہر کے بقول قومی خزانے میں چند فیصد ہی ٹیکس جمع کروا پاتا ہے۔

وہی کلاس جسے ٹھوکر مارنے میں اسے کچھ تاخیر ہو گئی تھی۔ لیکن معاشی درجہ بندی سے پرے وہ سب ایک دوسرے سے جڑے...... محبت بھرے رشتے تھے اور یہ صاف ظاہر تھا۔

اسے شدید احساسِ کمتری ہوا۔ کتنے عرصے سے وہ اپنے آپ کو مضبوط کر رہی تھی۔ کتنے عرصے پہلے اسے لگا تھا اس نے خود کو سمجھا لیا ہے...... مگر یہ سچ تھی، کبھی بالکل برداشت نہیں ہوتا...... کہ کسی کو یہاں اس جگہ اس سے ملنے نہیں آنا تھا۔

اپنے باپ کو تو وہ اپنی سرکشی کی قبر میں دفن کر آئی تھی اور......

”ایما...... ایما کیا کر رہی ہو گی اس وقت......؟“

اس نے اندازہ لگانے کی کوشش کی۔ وہ دھماکوں میں گھرے، چکنا چور کھڑکیوں والے، کسی پھٹے پرانے اسپتال کی آپریشن ٹیبل پر تکلیف سے کراہتے، درد سے چلاتے انسانوں کے زخم سی رہی ہو گی۔

کسی عظیم جدوجہد کے زخموں سے چور چور سپوت کی تکلیف اپنے ہاتھوں سے چنتے اسے ایک لمحے کو بھی یہ سوچنے کی فرصت نہیں ملی ہو گی کہ اس کی بہن دنیا کے کس نامعلوم کونے میں زندگی کے کن عذابوں میں گھری، اسے یاد کر رہی ہے...... آنسو پینے کی زبردست کوشش میں، اس کا گلا بری طرح دکھ رہا تھا۔

اور یہاں آنا ہی کسے تھا...... سوائے اس بے رحم گھڑی کے...... جو قیامت کے کئی دن گزار کر بھی آ نہیں رہی تھی۔

ملاقات کا وقت ختم ہو رہا تھا۔ آنے والے مہمان اپنی منزلوں کو روانہ ہونے والے تھے...... وہ ہاسٹل واپسی کے ارادے سے کالج کے مین آفس کے باہر پڑے میز کرسی سے اپنا سامان اٹھا کر پلٹ رہی تھی کہ اسے لگا...... اس کا وہم سچا ہو گیا ہے۔

(باقی آئندہ)

ناولٹ

تھوڑے تھوڑے کھوئے لمحے

تابندہ نعیم

پاکستان کی انتہائی معتبر، انتہائی خوب صورت اور انتہائی گہرے جملے لکھنے والی مصنفہ رفعت ناہید سجاد کے انداز تحریر سے متاثر ہو کر شروع کی جانے والی یہ کہانی گزشتہ کئی سالوں سے ٹکڑوں کی شکل میں لکھی جاتی رہی۔ اس عرصے میں پاکستانی معاشرہ تبدیل ہوچکا ہے۔ اب پاکستان کے پبلک پارکس میں شاید ہی کوئی غیر ملکی خاتون پاکستانی طالبات کو شام کی تفریح کرانے نکلتی ہو... مگر ہمارے آپ کے اسی پاکستان میں کبھی ایسا ہوا کرتا تھا۔ کہانی فرضی ہے۔ اس کے واقعات سن انیس سو ستاسی سے انیس سو بچانوے تک کے حالات اور کرداروں پر مبنی ہیں، تاہم ان کی کسی حقیقی کردار یا واقعے سے مماثلت محض اتفاقیہ ہوسکتی ہے۔

دوسرا حصہ

''ہیلو...... پلیز اب یہ مت کہنا کہ تم نے مجھے پہچانا نہیں۔'' اس آواز کو پہچاننے میں وہ کوئی غلطی نہیں کرسکتی تھی مگر اس کا خیال تھا کہ جب ایسا وقت آئے گا تو کچھ نہ کچھ غیر معمولی ضرور ہوگا۔

وہ اس کا راستہ روکے حیرت سے پوچھ رہا تھا۔

''ایمانداری سے کہو؟ تم نے آج بھی مجھے نہیں پہچانا...... میں کیسے اس بات کا یقین کرلوں......؟''

وہ خاموش کھڑی تھی...... اور دیکھ رہی تھی کہ
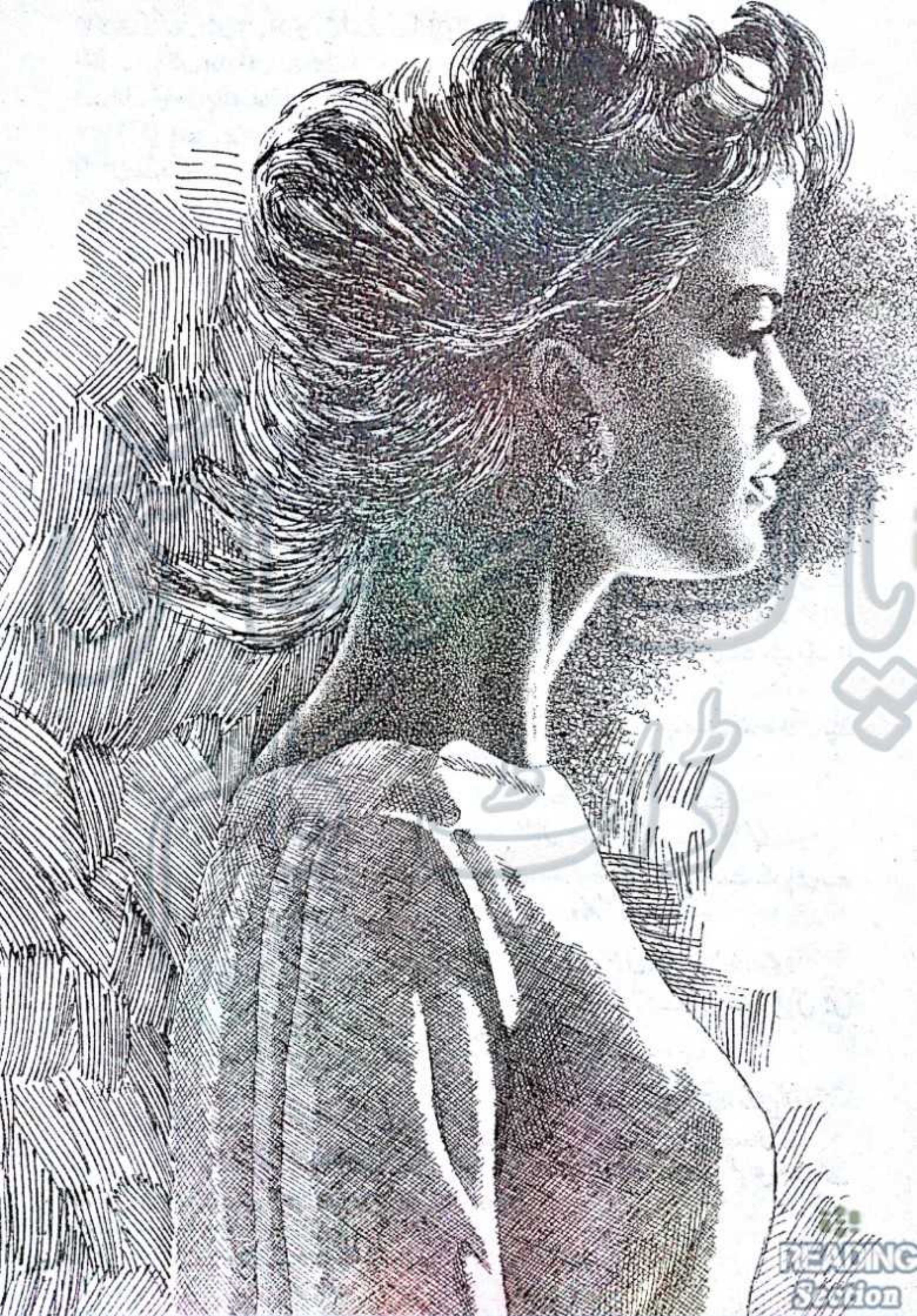
کائنات کی گردش میں اس گھڑی کے آنے سے کوئی انقلاب برپا نہیں ہوا، جس نے پچھلے دو ہفتوں سے اسے خوف کی سولی پر لٹکا رکھا تھا۔

''کیا بات ہے...... تم کچھ بولتی کیوں نہیں؟'' اس نے دیکھا اس کے سامنے کھڑی لڑکی کسی نتیجے تک پہنچنے کا فیصلہ بس اب سنانے ہی والی تھی۔

''نہیں......'' فہد نے اسے جیسے کچھ سنبھل کر کہتے ہوئے سنا۔ ''تمہیں لگا بڑھاپے نے میری یادداشت چھین لی ہے؟'' فہد کی بھویں بے ساختہ چڑھیں۔

''بڑ......ھاپا؟'' وہ بے ساختہ ہنس رہا تھا۔

''معاف کرنا، زیادہ پڑھے لکھے لوگوں میں، میرا اٹھنا بیٹھنا نہیں...... مگر سنا ہے وہ اپنا دماغ کہیں بھی رکھ کر بھول سکتے ہیں۔''

وہ ایک، ایک لفظ پر زور دیتا، بڑے خوشگوار انداز میں بول رہا تھا۔

''اور...... کیسی ہو؟ کیا کرتی رہیں اتنے دن تک؟''

سبرینہ کو اس کے چہرے کی خوشگواریت، اس کے انداز کی غیر سنجیدگی بہت زور سے چبھی تھی۔ وہ اتنے آرام سے بات کر رہا تھا جیسے وہ ہمیشہ ایسے ہی حالات میں ملتے رہنے کے عادی رہے ہوں۔ بہت دیر بعد سبرینہ نے منہ کھولا تو اس کے جواب میں طنز اور سوال دونوں تھے۔

''بہت دن لگے تمہیں آنے میں...... مجھے لگتا تھا کہ تم اگلے دن ہی مجھ سے ملنے آؤ گے لیکن......'' وہ ٹھٹکا تھا۔ یہ اس کا وہم تھا یا کچھ اور...... اسے کیوں لگا کہ اس کے سامنے کھڑی لڑکی کی آنکھوں میں ایک عجیب سا شک، ایک دل خراش بدگمانی ہے۔

''لیکن......'' اس نے پھر کہنا چاہا۔ ''مجھے کچھ دن کے لیے لاہور سے باہر جانا پڑا۔''

''شاید مخبری کا انعام لینے......'' وہ اس پر ایک خاموش نظر ڈال کر ہاسٹل کی طرف بڑھ رہی تھی۔

''مجھے افسوس ہے کہ تمہیں انتظار کرنا پڑا......''

وہ تیزی سے قدم اٹھاتا اس کے ساتھ ساتھ تھا۔

''انتظار......؟'' اس نے کچھ توقف سے کہا۔

''ہاں انتظار تو بہت کرنا پڑا۔''

''پھر تو واقعی مجھے افسوس ہے لیکن آئندہ ایسا نہیں ہوگا...... یہ میرا وعدہ ہے۔''

وہ کس آئندہ کی بات کر رہا تھا۔ اس کا اس سے وعدوں اور ارادوں والا کون سا واسطہ تھا۔ وہ سوچنا نہیں چاہتی تھی مگر کالج کے وسیع لان سے گزر کر ہاسٹل کو جانے والی اینٹوں کی روش پر مڑتے ہوئے وہ یہی سوچ رہی تھی۔

جونیئر ہاسٹل کے دور سے نظر آتے ٹیرس پر کچھ تولیے سوکھنے کے منتظر تھے۔ بجلی کے کھمبوں سے عمارت تک جاتی تاروں پر کوّے شور مچا رہے تھے...... ستمبر...... کی قدرے ماند پڑتی دھوپ، اونچے درختوں پر شام کا رقص...... بس شروع ہی کیا چاہتی تھی۔

وہ جس دنیا سے آئی تھی وہاں ایسے روشن لمبے دنوں کو خوش قسمتی کی علامت سمجھا جاتا تھا مگر اس دوسری دنیا میں یہ دن ہر روز اس کے لیے ایک نیا امتحان بن رہے تھے۔

فہد نے اس کے کندھے سے کندھا ملا کر چلتے دلچسپی سے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی۔

''بہت صحت افزا مقام لگتا ہے۔''

''ہاں بہت......'' اس نے مختصراً کہا۔

پرانے ''ریڈ ہاؤس'' کی عمارت کے پاس سے گزرتے۔ وہ پھر مسکرایا۔

''اور یہاں جنوں بھوتوں کا بسیرا ہوگا؟''

''ہاں شاید......'' اسے اس کے اشتیاق میں رتی بھر دلچسپی نہیں تھی۔

''پھر بھی یہاں رہتی ہو، تمہیں ڈر نہیں لگتا؟''

''گھوسٹس، اسپرٹس......'' وہ کہہ رہی تھی۔

''روحیں، انسانوں سے تو کم ہی خطرناک ہوں گی۔''

''بہت دکھی ڈائیلا گز بولنے لگی ہو۔ کیوں بھئی، انسانوں نے کیا بگاڑ دیا تمہارا اچانک......؟''
''اچانک......؟''اس نے برآمدے کی پہلی سیڑھی پر قدم رکھتے دُہرایا۔
''اوکے...... میں جانتا ہوں تمہارے جیسے لوگ دنیا سے ناخوش ہی رہتے ہیں، حالانکہ مجھے یقین ہے دنیا نے تمہارا ابھی کچھ نہیں بگاڑا ہوگا۔''
وہ بوکھلا گئی تھی وہ ایسے بات کر رہا تھا جیسے اس کا برسوں پرانا واقف ہو۔
''اور تم وہاں کھڑی کیا کر رہی تھیں ،میرا انتظار؟''
انتظار......انتظار......اس ایک لفظ سے چڑ تھی اسے۔ اس نے جھلا کر اپنا سر اٹھایا لیکن اس کی آنکھوں میں ٹھہرا، قطعی غیر سنجیدہ تاثر دیکھ کر کوئی سخت بات کہنے سے باز رہی۔
''نہیں میری ڈیوٹی تھی۔ آج ہاسٹل کی لڑکیوں کا ان کے گھر والوں سے ملاقات کا دن ہوتا ہے۔''
''ملاقات کا دن؟ کیا یہ کوئی جیل ہے؟ سچ بتاؤ، تم نے مجھے واقعی نہیں پہچانا تھا ناں......؟''
ایک تو پتا نہیں......اسے پہچانے جانے پر اتنا اصرار کیوں تھا......وہ چڑ گئی۔
''پہچان تو لیا تھا۔''فہد نے اس کے پیچھے، پیچھے سیڑھیاں چڑھتے اس کی آواز کی واضح جھلاہٹ پر، ایک بار پھر دھیان دیا تھا۔ وہ جس دن سے ملی تھی، ایسی ہی تھی......جیسے کوئی اور انسان...... وہ پوری کی پوری وہی تھی......پھر بھی کچھ تھا جو اپنی جگہ پر نہیں تھا۔
وہ خاموشی سے اپنے کمرے کے جالی والے دروازے پر جھولتا تالا کھولنے لگی۔
''تم نے بتایا نہیں، تم ہمارے وطن کب آئیں؟''
''ہمارے وطن......؟'' تالا کھولتی سبرینہ کے ہاتھ سے چابی چھوٹ کر گری جسے اٹھانے کو وہ....بے ساختہ ہی جھکی۔

''ہاں ٹھیک ہے، یہ تمہارا وطن ہے، اور میں ایک بے وطن ہوں بہر حال......'' اس کی آنکھیں دھندلانے لگی تھیں۔ وہ اس کی طرف پشت کیے کمرے میں آئی۔ لائٹ جلائی۔ سبز جلد والا رجسٹر اور نیلے رنگ کے کارڈز کا پلندہ میز پر ڈھیر کیا اور پلکیں جھپک، جھپک کر خود کو نارمل کرنے لگی۔
''ٹھیک ہے ہر انسان کو اپنی ملکیت پر استحقاق جتانے کا حق ہے۔''وہ اس کے پیچھے، پیچھے آیا اور دروازے کے باہر ہی رک گیا۔
''تم نے بتایا نہیں۔''
''کچھ عرصہ ہوا۔''
''اور یہاں اس کالج میں کب سے ہو؟''
''یہاں......''وہ اٹکی......''بہت عرصہ نہیں ہوا۔''
''اور یہاں کر کیا کر رہی ہو؟''
''ظاہر ہے پڑھا رہی ہوں۔''
''اور آئندہ کیا کرو گی؟''
''آئندہ......؟''وہ کسی معمول کی طرح جواب دیتی رک گئی۔ یہ وہی تھا ناں......جس نے پچھلے کتنے دنوں سے اس کی نیندیں حرام کر رکھی تھیں۔ سبرینہ نے اس کی سنگین نظروں کا بہادری سے سامنا کیا۔
''آئندہ کے لیے بھی میں......نہیں پڑھاؤں گی۔''
''یعنی......؟''وہ سبرینہ کی بات کا مطلب نہیں سمجھ پا رہا تھا یا اس پر یقین کرنے میں دشواری محسوس کر رہا تھا۔ روکتے، روکتے اس کے منہ سے جو نکلا، اس کا اسے بہت دیر تک افسوس رہا۔
''یعنی......اتنی ساری ذہانت ،اتنی بہت سی ڈگریاں......؟ تو کیا میں یہ سمجھوں کہ تم میرے غریب ملک کے تعلیمی نظام کو سدھارنے کے لیے وقف کر رہی ہو......پلیز اب یہ مت کہنا کہ تمہیں میرے ملک سے محبت ہوگئی ہے۔''
اس کی تمسخر سے بلند ہوتی آواز کا جوش ایک دم ہی ٹھنڈا پڑا تھا......اسے لگا اس کے سامنے کرسی پر اپنے دونوں ہاتھ ایک دوسرے میں سختی سے پیوست

کیے بیٹھی لڑکی، ایسے شدید طنز کی مستحق نہیں، اس کا کوئی قصور نہیں۔

''معاف کرنا...... تم نے بات ہی ایسی کی...... تم تو کیمبرج جا رہی تھیں؟'' اس کی بات پر وہ پھیکی سی ہنسی ہنس دی۔ جیسے اپنا تمسخر خود اڑانے کے کھیل میں اس کے ساتھ شامل ہو گئی ہو۔

''کیوں......؟ کیمبرج جانے والے تمہارے ملک میں پڑھانے لگیں تو تمہیں اس پر اعتراض کیوں ہے؟''

فہد کو شبہ ہوا اس نے اس کی آنکھوں میں پانی اکٹھا ہوتے دیکھا تھا۔

''کیا ہوا ہوگا......؟ کس چیز نے اسے اتنا دکھی کر دیا ہے۔'' اس نے دل ہی دل میں سوچا۔

''میں نے تمہیں بیٹھنے کے لیے بھی نہیں کہا۔ چائے، کافی، ٹھنڈا، کچھ پیو گے تم......؟ یا باہر ہی کھڑے رہو گے؟'' وہ اب فرض شناس میزبان بن چکی تھی۔

وہ جواب کا انتظار کیے بغیر کمرے کے پیچھے بنے مختصر کچن کی طرف بڑھ گئی تھی۔ جہاں وقت بے وقت صرف چائے کافی ہی تیار ہو سکتی تھی۔

وہ کتنی دیر کچن کے کھلے دروازے کے دوسری طرف کے منظر پر نگاہ جمائے کھڑا رہا پھر کچھ دیر بعد بولا۔

''میرے کہنے کا مطلب تھا یہ جگہ تمہاری منزل تو نہیں ہو سکتی۔'' اس نے کتنی دیر پہلے سوال کیا تھا اور جواب میں صرف پانی کے گرنے کی آواز اور برتنوں کی کھڑکھڑاہٹ سن رہا تھا۔ پھر جیسے اکتا کر اس نے نظریں ہٹالیں۔

وہ آہستگی سے ٹہلتا مختصر سے کمرے کی دیوار پر لٹکے کیلنڈر کا جائزہ لینے لگا پھر کتابوں کی سادہ سی شیلف میں رکھے لکڑی کے ننھے مجسموں کی طرف چلا گیا۔

''بات سنو......''

سبرینہ نے کچن کے دروازے سے جھانکا۔

''تم بہت بدل گئی ہو۔''

آلتی پالتی مارے گیان میں مصروف لکڑی کے بدھا کا سر چھوتے، اس نے جیسے ایک اخباری بیان پڑھا تھا سبرینہ کو لگا اتنے دن سے وہ خوف کی جس صلیب پر گڑی تھی اس کے قبضے ایک، ایک کر کے اکھڑنے لگے ہیں۔ وہ خاموشی سے پلٹی اور اس کے لیے کافی کا مگ اٹھا لائی۔

''کیا یہ بری بات ہے؟''

''پتا نہیں۔''

وہ مگ سنبھال کر، میز کے پاس پڑی کرسی پر بیٹھ گیا۔

''شاید وقت بھی کو بدل دیتا ہے مگر ابھی اتنا وقت نہیں گزرا مگر وقت کیا ہوتا ہے؟ ایک دن، ایک گھنٹا یا پوری زندگی......؟'' اس نے بے ساختگی میں خود کو مزید کچھ کہنے سے روکا تھا۔ وہ جو بحث شروع کرنے جا رہی تھی، اسے گھسیٹ کر دور لے جانے میں شدید نقصان کا اندیشہ تھا...... وہ خاموشی سے کڑوی کافی کی بھاپ کے پیچھے اس کے چہرے کو اپنے آپ سے الجھتے، دیکھتا رہا۔ بہت دیر بعد اس نے اپنا جھکا ہوا سر اٹھایا تھا۔ وہ پوچھ رہی تھی۔

''تم نے اپنے بارے میں کچھ بتایا تھا؟'' وہ صبر سے کام لینا چاہتا تھا۔ مگر ایسا نہیں ہو سکا۔ کافی کا مگ میز پر پٹخ کر وہ کھڑا ہو گیا۔

''میں نے اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ اعتبار کوئی دکھائی جا سکنے والی چیز نہیں ہوتا...... لیکن اگر ہوتا تو میں تمہیں ضرور دکھاتا......'' اس نے دروازے کی طرف قدم بڑھائے۔

''لیکن میں دوبارہ بھی آؤں گا، جب کبھی تم میرا اعتبار کر سکو۔'' سبرینہ چپ چاپ کھلے دروازے کے باہر جھانکتی رہی، جہاں سے ابھی ابھی ایک انتہائی اجنبی سخت براماں کر نکلا تھا۔

☆☆☆

کبھی کبھی صدیوں تک ایک راستے پر چلتے رہنے کے بعد آدمی کو احساس ہوتا ہے کہ یہ تو اس کا راستہ نہیں تھا۔ برسوں کی رفاقتیں دنیا داری کے تکلفات بن جاتی ہیں۔ منزل کے نشان، کمین گاہوں کے سراغ، آنکھوں کا دھوکا اور نظر کا فریب معلوم ہوتے ہیں اور زندگی بھر کی ریاضت کا حاصل وہ ایک انسان بن جاتا ہے، جسے ابھی آپ نے ٹھیک سے جانا بھی نہیں ہوتا۔

وہ پہلے دن بھی جانتا تھا کہ ایسی کسی حماقت کے نتائج زیادہ پسندیدہ نہیں ہوں گے پھر بھی ایک ہفتے میں دوسری بار، اس کے ہاسٹل کا رخ کرتے اسے یہ احساس تک نہیں تھا کہ وہ اپنے ساتھ بھی کچھ اچھا نہیں کر رہا...... وہ تو جیسے ہمالیہ تھی، برف پوش اور یخ بستہ ہلاکت خیز طوفان جس سے ٹکرا کر اپنا رخ تبدیل کرتے ہیں۔ وہ اسے بہت زیادہ جانتا نہیں تھا۔ وہ اس کے ایک دوست کی دوست تھی۔ جن دنوں اس نے اسے دیکھا۔ وہ ایڈنبرا یونیورسٹی کے نوجوان انٹلیکچوئل کراؤڈ کی جان تھی...... فہد جیسے پاکستانی اسٹوڈنٹس کے لیے اس کی شخصیت کافی... دل اسٹائل تھی۔ وہ اکنامکس اور سیاسیت کے ساتھ بیچلرز کرنے کے بعد ان دنوں انٹرنیشنل اینڈ ڈیولپمنٹ اکنامکس میں ماسٹرز کی تیاری کر رہی تھی۔ وہ بی بی سی اور اقوام متحدہ کے ورلڈ فوڈ پروگرام کے لیے کچھ اہم انٹرن شپس کر چکی تھی...... اس کے کوائف پر بین الاقوامی ترقی کے اہم موضوعات پر کی گئی تحقیقاتی اسائنمنٹس تھیں، جنہیں نامور برطانوی اخبار نے اہتمام سے چھاپا تھا۔

یقیناً وہ فاروق فیروز کی اس قابل دوست کے جملہ کوائف سے کبھی آگاہ نہ ہو پاتا، اگر فاروق اپنی اس خاص دوست کی خوبیوں کے بارے میں ہر وقت، ہر جگہ، ہر کسی کو آگاہ کرنا ضروری نہ سمجھتا۔ فہد فاروق کی اس دوست سے ایک دو ملاقاتوں میں ہی متاثر ہو گیا تھا۔

ایک ایسا خاص نمبر جسے آپ مجلد کرا کر رکھیں گے

وہ بڑی جذباتی باتیں بہت سہولت سے کر لیتی تھی۔ افریقا، ایشیا اور لاطینی، امریکی ملکوں میں غربت، جہالت اور منشیات کے اسمگلروں کے ہاتھوں مرنے والی آبادی کو ہیومن کیپیٹل، انسانی سرمائے میں بدلنے کے عجیب وغریب منصوبے بناتی تھی۔ وہ لندن کے ایک بڑے کالج میں پڑھانے والے کسی معتبر ریاضی دان کی بیٹی تھی اور وہ دنیا جس کے اعداد و شمار اس نے صرف کتابوں اور اخبارات کے ذریعے ہی جانے تھے، اس کی تقدیر بدلنے کے خواب دیکھا کرتی تھی۔

فہد کو یاد تھا جب فاروق اپنے دوستوں کو کہیں جمع کرنے میں کامیاب ہوجاتا تو وہ ان کے سامنے اپنے ناممکن خوابوں کا پتا دیتی نظمیں سنانے میں ہچکچاتی نہیں تھی...... وہ بلا کی خود اعتماد تھی...... وہ دیکھ سکتا تھا...... وہ جب اپنی سنہری مائل سبز آنکھیں مخاطب کی آنکھوں میں ڈال کر اختلاف کرتی...... تو سامنے والے کے پاس اتفاق کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہتا تھا۔ سبرینہ گیبرئیل ایک ایسی خاص لڑکی تھی۔ جسے سر اونچا کر کے دیکھا جاسکتا ہے۔ اور جس تک ہر کسی کی رسائی ممکن نہیں ہوتی۔

فاروق فیروز اس بات پر بھی اترایا پھرتا تھا کہ سبرینہ گیبرئیل نے اسے خود چنا اور یونیورسٹی کے بے شمار قابل طالب علموں میں صرف اسے اپنی دوستی کے قابل جانا...... فہد کو ایسا محسوس ہوا کہ فاروق اپنی اس ذہین وحسین دوست کی مقبولیت سے خائف بھی تھا، جس کا بے پناہ حسن اور ذہانت اس کے پاکستانی اور انڈین دوستوں کو اس سے حسد میں مبتلا کرتا رہتا تھا۔

کیا فاروق خود بھی سبرینہ سے جلن محسوس کرتا ہوگا......؟ پتا نہیں...... لیکن اس کے جاگیردارانہ پس منظر کی جھلک اس کے مزاج میں صاف نظر آتی تھی...... وہ فاروق کے پس منظر کا ٹھیک، ٹھیک اندازہ بھی نہ لگا سکا ہو تو بھی یہ جان گیا تھا کہ ان دونوں کے معاشی طبقوں میں کافی فرق ہے۔

فاروق کرکٹ کھیلتا تھا اور فہد کو کرکٹ کھیلنے کا موقع نہیں مل سکا تھا۔ ان کی پہلی ملاقات ایڈنبرا کے کرکٹ گراؤنڈ میں ہوئی تھی۔ پاکستانی اسٹوڈنٹس ایسوسی ایشن یہاں خاصی فعال تھی۔ کرکٹ گراؤنڈ کی ملاقات چند مشترکہ دوستوں کے ذریعے ایسوسی ایشن کی چند تقریبات تک پہنچی...... پھر فاروق نے اسے کئی بار ویک اینڈ پر کھیلے جانے والے کرکٹ میچز دیکھنے کی دعوت دی تھی۔ فہد وقت کی شدید کمی کا شکار رہتا تھا پھر بھی میچ دیکھنے کے لیے چودہ، چودہ گھنٹے کی ڈیوٹی کے بعد بھی تیار ہوجاتا۔

فاروق فیروز خان جنوبی پنجاب کے دیہات سے اٹھ کر ایڈنبرا یونیورسٹی کے لا اسکول تک اپنی ذہانت کے بل پر ہی پہنچا ہوگا۔ مگر یہاں آنے تک کے سفر میں اس کے رئیس خاندان کی بھاری وراثت کا پورا دخل تھا۔ اس کا باپ اور بھائی اہم برطانوی اداروں سے تعلیم یافتہ تھے۔ اسے نہ صرف اس خاندانی روایت کو آگے بڑھانا تھا بلکہ تعلیم مکمل کر کے اپنے بھائیوں کی طرح اپنی آبائی وراثت بھی سنبھالنی تھی۔ اپنے بھائیوں کے سیدھے سادے بیچلرز کے برعکس اسے یہاں قانون پڑھنے بھیجا گیا تھا۔ وہ قدرتی طور پر ذہین بھی تھا اور ترقی کرنے کا خواہش مند بھی وہ ایسی متاثر کُن باتیں کرتا کہ اس کے استاد اسے ترقی پزیر دنیا کا وہ انقلاب پسند سمجھنے پر مجبور ہوگئے تھے، جو چاہے تو تنہا ہی تیسری دنیا کی قسمت بدل سکتا ہے۔

کرکٹ کا کھیل اس کی رگ، رگ میں شامل تھا۔ یہاں آنے کے کچھ ہی عرصے میں وہ یونیورسٹی سطح کی کرکٹ میں اپنی جگہ بنا چکا تھا۔ لیکن وہ خوب جانتا تھا کہ اس کے باپ کو اسے پروفیشنل کرکٹر بنانے میں کوئی دلچسپی نہیں۔ ان کا خاندان تاریخی طور پر اپنے علاقے میں سیاسی اثر رسوخ رکھتا تھا۔ لیکن اپنے بڑے دو بیٹوں کے ساتھ صوبائی سیاست میں قدم جمانے کے بعد فاروق کا باپ فیروز معظم خان اب اپنے تیسرے نمبر کے سب سے قابل بیٹے کو قومی

سیاست میں لانا اور کامیاب ہوتے دیکھنا چاہتا تھا۔ فاروق کو اپنے باپ کے عزائم پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ لیکن پاکستان واپس لوٹنے تک وہ کرکٹ کا شوق جاری رکھ سکتا تھا بس اگر اس دن یونیورسٹی گراؤنڈ پر ایک اہم ویک اینڈ میچ کے دوران ایک مشکل کیچ پکڑنے کی کوشش میں، باؤنڈری کے قریب پھسلا نہ ہوتا گھٹنا بھی چھلا، کیچ بھی ڈراپ ہوا لیکن اس سے بھی بڑا واقعہ حسین وجمیل سبرینہ گیبرئیل سے ہونے والا پہلا ڈرامائی ٹکراؤ تھا جو باؤنڈری کے پاس پہلی قطار میں بیٹھی اس مکمل پھسل جانے والے کا نام فیلڈر سے پوچھ رہی تھی۔

''تمہیں کہیں چوٹ تو نہیں آئی؟ تم ٹھیک تو ہو؟'' بعد میں اسے پتا چلا کہ حسینہ کو نہ کرکٹ میں دلچسپی تھی نہ اس کی وہاں موجودگی کسی کرکٹ ہیرو کو داد دینے کے لیے تھی۔ وہ اپنے ایک یونیورسٹی پراجیکٹ کے لیے (crowd behaviour) ہجوم کے رویوں پر تحقیق کر رہی تھی۔ اسے اپنے مضمون کے مواد میں حقیقت کا رنگ بھرنا تھا۔ اس خوش شکل جنوبی ایشیائی نوجوان سے اچانک ہونے والی ملاقات اس تحقیق کا حصہ تو نہ بن سکی مگر اس جادوئی دنیا کو قریب سے جاننے کا بہانہ ضرور بن گئی۔ جس کے مناظر اس نے Mollie kay کے پُراسرار ناولز میں کئی بار دور سے دیکھے اور پڑھے تھے۔

ان کی اگلی ملاقات اسی میچ کے بعد اسی روز ہوئی پھر کچھ دن بعد...... اور پھر بار، بار ہونے لگی۔

فاروق کے دوست حیران تھے کہ ایک ترقی پذیر ملک کا ایسا زبردست امیر زادہ جو یہاں قانون کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے آیا تھا، ہر چیز میں دلچسپی لے رہا تھا سوائے پڑھائی کے، اپنے ساتھی اسٹوڈنٹس کے برعکس اسے کبھی ملازمت نہیں کرنی پڑی تھی۔ اس کا ہاتھ کبھی تنگ نہیں رہا...... وہ ہر چیز خرید سکتا تھا اس کے پیچھے کوئی بھی لڑکی جان دینے کو تیار ہو جاتی۔

لیکن انہوں نے دیکھا وہ سبرینہ گیبرئیل کے لیے سچ مچ پاگل ہوا اٹھا تھا۔ وہ والہانہ تابعداری سے اس ذرا سی لڑکی کے تمغۂ رفاقت کو گلے میں لٹکائے پھرتا اور بالکل بے مزہ نہ ہوتا ایگو، انا، سیلف ریسپیکٹ، عزتِ نفس جیسے الفاظ اس لڑکی کے قدموں میں ہر دم بچھی جانے والی فاروق کی طبیعت میں جیسے تھے ہی نہیں...... یقیناً اس میں ضرور کوئی ایسی بات ہوگی...... پھر بھی فاروق کے دوستوں کو اندازہ تھا کہ یہ دلچسپی زیادہ دیر برقرار نہیں رہے گی۔

انہی دنوں ایک بڑے عالمی ادارے کی طرف سے منعقد کرائے گئے مقابلۂ مضمون نویسی میں سبرینہ گیبرئیل کا لکھا ہوا مضمون بہترین قرار پایا تھا۔ یہ اعزاز ملنے کی خوشی میں سبرینہ نے فاروق کے دوستوں کو کھانے پر اکٹھا کیا تھا۔ اس دعوت میں فہد مرتضٰی بھی مدعو تھا۔

فہد نے ایسے لوگ دیکھے تو تھے مگر بہت زیادہ نہیں...... ایسے عجیب کام کرنے والوں کے بارے میں اس کا تجربہ بہت زیادہ نہیں تھا۔ وہ کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج سے ایم بی بی ایس اور میو اسپتال میں ایک سال تک ریزیڈنسی کرنے کے بعد اپنے باپ کی شدید خواہش پر انتہائی محنت سے حاصل کیے گئے ایک اسکالرشپ کے نتیجے میں ایڈنبرا پہنچا تھا اور یونیورسٹی کے

(Human cognitve neuro science research unit)

سے ایم ایس سی کرنے کے بعد ان دنوں یونیورسٹی اسپتال سینیورولوجی کے ساتھ ریزیڈنسی کر رہا تھا۔ اس کا تعلیمی ریکارڈ اتنا اچھا تھا کہ کوئی بھی یقین نہیں کرتا...... اسے میڈیسن پڑھنے میں کبھی دلچسپی بہت زیادہ نہیں رہی تھی۔ اگر وہ ایک محنتی ڈاکٹر کا بیٹا نہ ہوتا اور اس کے بڑے بھائی نے اپنے کیریئر کے انتخاب کے وقت، اس کے باپ کو مایوس نہ کیا ہوتا تو شاید وہ اپنے لیے کسی اور شعبے کا انتخاب کرنا پسند کرتا...... کوئی اسپورٹس کھیلتا...... اس کے پاس بھی ایڈنبرا میں قریب آنے والے فاروق فیروز خان کی طرح وجہ بے وجہ دوستوں کی محفلیں

منعقد کرنے اور ان میں شرکت کرنے کا زیادہ وقت ہوتا مگر ایسا نہیں تھا۔
پھر بھی جب کبھی وہ اپنی تھکا دینے والی ریسرچ لیبز اور سخت لگی بندھی روٹین سے گھبرا جاتا تو فاروق اور اس جیسے کچھ دیگر پاکستانی اسٹوڈنٹس کی سرگرمیوں میں شامل ہونا اس کے لیے آئندہ کچھ مہینوں تک کی خشک روٹین کو آسان بنا دیتا تھا۔ فہد نے اپنی تین سالہ ریزیڈنسی کے خاتمے پر پاکستان واپسی سے پہلے سبرینہ کی اس آخری دعوت میں اتنا سنا تھا کہ جس پراجیکٹ پر اسے عالمی ادارے کی طرف سے اعزاز ملا ہے......
اس کی بنا پر اسے کیمبرج یونیورسٹی سے اکنامک ریسرچ میں ایم فل کرنے کی پیشکش ہوئی ہے جبکہ ابھی اس کا ماسٹرز مکمل نہیں ہوا تھا۔ آسمان میں کون سا سوراخ کیا ہوگا اس نے ایسی پیشکش حاصل کرنے کے لیے وہ صرف اندازہ ہی لگا سکتا تھا۔

☆☆☆

یہ چار سال پہلے کی بات تھی...... وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ آسمان میں چھید کرنے کے خواب دیکھتی ایسی زبردست لڑکی کو وہ کبھی اپنے ملک میں اتنی بدلی ہوئی شخصیت کے روپ میں دیکھے گا۔ وہ چونک، چونک کر اس کے چہرے میں اس لڑکی کو کھوجنے کی کوشش کرتا جسے اس نے ایڈنبرا میں دیکھا تھا مگر اسے ناکامی ہوئی۔ یہ تو کوئی اور لڑکی تھی۔ ایسا لگتا ہر بار اس سے ملاقات میں اپنا تعارف کروانا پڑے گا۔ وہ جو ایک موہوم سی مصلحت اندیشی سے اس کے بار، بار چلے آنے کو برداشت کر رہی تھی اس سے زیادہ کچھ کہنے کو تیار نہیں تھی جتنا اسے پہلی بار یہاں آمد پر معلوم ہوا۔ اسے لگا وہ کتنے دنوں سے ایک یخ بستہ پہاڑ کی برف توڑنے کی کوشش کر رہا ہے۔ جس کے نیچے لہریں لیتے لاوے کی سرسراہٹ دور تک سنی جا سکتی ہے۔
سبرینہ حیرت سے اسے دیکھتی۔
''یہ کیسا انسان ہے، لوگوں کے پاس اپنے ضروری رشتے نبھانے کا وقت نہیں اور یہ...... اس کو دیکھو ذرا...... کیا اسے زندگی میں اور کوئی کام نہیں......؟''
اس کے پاس ہر اعتراض کا جواب تھا۔
''کیوں لڑکیوں کا ہاسٹل ہے تو کیا؟ میں تمہیں شریف آدمی نہیں لگتا۔''
''انتظامیہ کو کیوں اعتراض ہوگا؟ تم کوئی بچی نہیں ہو......اور یہ کوئی افیئر نہیں ہے۔''
''تم ہمارے ملک میں مہمان ہو اور مہمانوں کا خیال رکھنا ہماری روایتوں میں سے ہے۔''
اور
''مجھے کیوں لگتا ہے کہ تمہیں ایک دوست کی ضرورت ہے؟''
''دوست، دوست......'' وہ چڑ کر اسٹوڈنٹس کی اسائنمنٹس چیک کرنے لگتی......وہ اس پر ظاہر کرنا چاہتی تھی کہ اس کے ہونے نہ ہونے، آنے نہ آنے سے اسے کوئی فرق نہیں پڑتا اور اگر اسے ذرا بھی اپنی عزت کا خیال ہے تو اس کے حال پر لعنت بھیج کر واپس چلا جائے مگر وہ ایسا نہیں کر سکتا تھا۔
وہ ہر ملاقات پر کسی پرانی بات کا ذکر کرتا...... حالانکہ ان کے گزرے ہوئے کل میں کوئی بات بھی مشترک نہیں تھی۔ سوائے ایک شخص کے...... جس کا ذکر ان کے درمیان بہت سرسری انداز میں آنے کے بعد، بہت غیر محسوس طریقے سے ختم کر دیا گیا تھا۔
اس دن وہ اسے اپنے بارے میں بتانے لگا...... کیسے وہ اپنے باپ کی خواہش پر میڈیسن میں آیا کیسے نیورولوجی کے شعبے میں اسے دلچسپی پیدا ہوئی...... کیسے ایڈنبرا کی ریسرچ یہاں اس کے کام آ رہی ہے...... کیوں وہ نیورو سائنس میں مزید ریسرچ کا خواہش مند ہے۔ کیوں پاکستان میں کلینیکل نیورولوجی کے لیے ایک الگ فیلوشپ پروگرام شروع کیا جانا ضروری ہے۔ کیوں ڈاکٹرز پاکستان سے باہر جا کر واپس آنا بھول جاتے ہیں اور کیوں اسے لگتا ہے کہ اس کی ضرورت پاکستان

میں زیادہ ہے۔

اسے خوشی ہوئی وہ اس کی بات دھیان سے سن رہی تھی۔

فہد کو کچھ یاد آیا۔

''تم بھی تو ترقی کے خواب دیکھتی تھیں...... انقلاب لانا چاہتی تھیں۔ مجھے تمہاری باتیں سن کر رشک آتا تھا۔ میری بھی خواہش تھی کہ اپنا شعبہ تبدیل کرلوں...... انسانی ترقی، عالمی امن کے جھنڈے اٹھاؤں...... انقلاب لاؤں، کتابیں لکھوں...... کیا زبردست نظمیں سناتی تھیں تم، تمہیں یاد ہے؟'' اسے کچھ یاد نہیں تھا...... وہ اپنی یادداشت کھودینا چاہتی تھی۔ اس کی آنکھوں میں برف اترتی دیکھ کر وہ چپ ہوگیا، دراصل یہ یادداشت کی کمزوری کا کیس نہیں تھا۔ یہ کسی ناخوشگوار بات کو بھلانے کی شعوری کوشش تھی۔

''ہم زندگی میں کبھی نہ کبھی آئیڈیالسٹ ہوتے ہیں۔'' بڑی دیر بعد اس نے اسے بولتے سنا۔

''تم نے...... ایمرسن کو پڑھا ہے؟ میرے والد نے مجھے بہت کم عمری میں اس کی تحریروں سے متعارف کروایا۔ شروع میں وہ مجھے بہت عجیب لگا...... بعد میں، میں اس کے انفرادیت کے فلسفے کی قائل ہوگئی۔''

فہد خاموش بیٹھا رہ گیا...... وہ اپنے بارے میں اس لیے بات کررہی تھی کہ بات کو بدل کر کہیں اور لے جاسکے اس نے ذرا دیر صبر کیا...... پھر چلا اٹھا۔

''اس امریکی مضمون نگار کا میرے اس سوال سے کوئی تعلق نہیں۔''

وہ حیران رہ گئی۔

''کیوں نہیں؟ پہلے میں دیوار کے ایک طرف کھڑی تھی۔ اب دوسری طرف ہوں...... انقلاب کی باتیں...... لٹریچر...... شاعری...... ایک وقت کے بعد سب بیکار لگنے لگتے ہیں...... ان کا حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔''

''تو پھر کس چیز کا واسطہ ہوتا ہے؟''

فہد نے اسے اپنی غلطی پکڑ کر خاموش ہوتے دیکھا۔ اسے افسوس ہوا۔ یہ وہ خاص لڑکی ہے، جسے کبھی اس نے بہت دور سے، بہت دھیان سے دیکھا تھا۔ اور جس میں آج اتنی جرأت نہیں تھی کہ ایک زوردار ڈانٹ پلا کر اسے بے تکلفی سے جرح کرنے کا مزہ چکھا سکے...... اسے دوبارہ کبھی یہاں آنے کی جرأت نہ ہو۔

وہ بے آواز ہنسا۔

''تم چاہتی ہو، میں اپنا سوال بھول جاؤں...... اور دوبارہ تمہیں تنگ کرنے یہاں نہ آؤں؟''

''مطلب......؟'' اس نے ہر قسم کی رواداری برتنے کا ارادہ بالآخر ملتوی کردیا۔

''کیا تمہیں اب تک اندازہ نہیں ہوا کہ میں تمہیں ناپسند کرتی ہوں؟'' وہ اونچی آواز میں ہنسا...... چاروں طرف دیکھ کر اس نے اپنی ہنسی کی آواز روک لی۔

''میں تو کبھی اس خوش فہمی میں یہاں تک نہیں آیا کہ تم مجھے پسند کرتی ہوگی۔'' اس نے ایک لمحے کو رک کر اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ ''ظاہر ہے میں فاروق تو نہیں بن سکتا۔''

آہستگی سے ادا کیے جملے کا اثر فہد نے اس کے چہرے پر کھوجنا چاہا لیکن وہ اس کی بات پر نہیں، اپنے ہاتھوں کے ناخنوں پر غور کررہی تھی جیسے اس نے اس کی بات سنی ان سنی کردی ہو۔ غصے کی ایک سلگا دینے والی لہر کو فہد نے اپنے پیروں سے سر تک جاتے محسوس کیا۔

''تم جانتی ہو تم ایک اچھی ایکٹریس نہیں ہو؟''

وہ اضطراری کیفیت میں اٹھ کھڑا ہوا۔

''میں صرف اور صرف، تمہاری مدد کرنا چاہتا ہوں پھر تم مجھ سے کیا چھپانا چاہتی ہو اور کیوں؟''

اس نے خاموشی سے جھلا کر اٹھ کھڑے ہونے والے شخص کو دیکھا اور ہموار لہجے میں بولی۔

''میں تم سے کچھ چھپانا نہیں چاہتی۔''

''اچھا بس، اب جھوٹ بولنا بند کردو......

تمہاری اطلاع کے لیے تم جو کچھ بھی چھپانا چاہتی ہو، میں جانتا ہوں۔''

''کیا جانتے ہو تم؟'' فہد نے اس کی آنکھوں کی برف، ایک لمحے میں پگھلتی دیکھی تھی۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ اس کے چہرے کے عضلات تن گئے تھے۔

''اسے جسے تم صاف چھپانا چاہتی ہو۔''

اس کی آنکھوں میں رحم نہیں تھا۔ کیسی بے وقوفی ہوئی اس سے۔ کتنی دیر وہ اپنے اوپر گڑی چیلنج کرتی نظروں کو ٹالتی رہی پھر جیسے وہ تھک سی گئی۔

''میں نے تم سے کچھ نہیں چھپایا۔''

وہ اس کے چہرے پر پھیلتے شکستگی کے رنگوں سے شاید ابھی کہ ابھی کوئی مطلب نکالتا اگر اچانک اس نے سر اٹھا کر اس کی آنکھوں میں دیکھ نہ لیا ہوتا۔ صرف ایک لمحے کی بات تھی۔ وہ سکون سے کہہ رہی تھی۔

''ہو سکتا ہے، میں جو تم سے چھپانا چاہتی ہوں تم اسے سننے کے لیے مناسب شخص نہ ہو۔''

''یہ غلط بات ہے۔'' بہت دیر بعد اس کے منہ سے نکلا۔ ''تم اگر میری نیک نیتی پر شک کرو گی تو مجھے اچھا نہیں لگے گا۔''

وہ اٹھا تو سخت مایوس تھا...... وہ میدان چھوڑ کر بھاگی نہیں تھی، بس اس نے اپنا مورچہ تبدیل کر لیا تھا۔

وہ ٹس بیٹھی، غصے میں بھرے آدمی کے دروازے کی طرف بڑھتے قدم گنتی رہی۔ یقیناً وہ بہت جلدی میں تھا۔ اس نے اس بد دماغ لڑکی پر پہلے ہی اپنا بہت وقت برباد کر دیا تھا۔

کتنی دیر وہ اس کے سیڑھیاں اترتے قدموں کی دھمک اپنے دل پر سنتی رہی پھر کسی احساس کے تحت اس نے اٹھ کر ٹیرس سے نیچے جھانکا...... ہاسٹل کے لان سے گزرنے والی بل کھاتی روش پر وہ تیز، تیز قدم اٹھاتا آگے جاتا جا رہا تھا۔ وہ غصے میں تھا یا رنج میں...... وہ اندازہ نہیں لگا سکی...... اس کے سامنے دور پانی اچھالتے فوارے کے پاس سے گھوم کر، وہ سرخ اینٹوں والی اس کشادہ روش پر مڑ گیا تھا جو اسے کالج کے مین گیٹ تک لے جاتی تھی۔ جہاں اچھے موسم میں بادام کے درخت سے موٹا، موٹا پھل گرا کرتا تھا۔ راستے کے پتھر تیز قدموں سے روندتے، ہاسٹل کی عمارت سے لگی سبز باڑھ کے پاس سے گزرتے، اس نے سر اٹھا کر ٹیرس کی ریلنگ سے نظر آتے سر پر ایک بدگمان نظر بھی پھینکی تھی۔

یا شاید یہ اس کا وہم ہی تھا...... وہ جا چکا تھا۔

سبرینہ نے آج ایک انتہائی مشکل گھڑی کو ایک سانس میں نمٹا لیا تھا۔

☆☆☆

آٹھ سے تین بجے تک وہ معمول سے زیادہ دلجمعی سے کلاسیں لیتی رہی۔ شام اس نے اینڈریا، ایلیسن اور سونیا کے ساتھ شادمان کی دکانیں چھانتے گزاری۔ وہ خود خوفزدہ نہیں تھی...... خوش تھی یہ انکشاف کتنا اطمینان دلانے والا، کتنا حرارت بخش تھا اس نے اپنا گمشدہ سیلف (اپنا آپ) تلاش کر لیا تھا۔ اب آئے کوئی اسے بلیک میل کرنے والا، دھمکیوں سے خوفزدہ کرنے والا...... وہ اپنے ارادوں سے اس کے پرخچے اڑا دے گی۔

اگلے کچھ دن وہ اسی جوش سے بیدار ہوتی رہی۔ ایک نئے ولولے سے زندگی میں شامل ہوتی رہی...... وہ جیسے اپنی ان دیکھی قید کے خاتمے کا جشن منا رہی تھی۔ وہ اپنے آپ کو اس زبردست بہادری پر خراج تحسین پیش کرنے کے ساتھ، ساتھ یہ یقین دلانا چاہتی تھی کہ اس کا کوئی بڑا نقصان نہیں ہوا۔

ہاسٹل کا کامن روم پہلی بار اس کی ہنسی کی آواز سے آشنا ہوا۔ ویک اینڈ کی سیر کے لیے لڑکیوں کو لے کر جاتے وہ پہلے کی طرح جان چھڑانے کے بجائے خوشی، خوشی تیار ہو گئی۔

وہ تبدیل ہو گئی ہے...... یہ اب کسی سے چھپا نہیں رہا تھا۔ آج تک وہ جیسے پردوں میں چھپی بیٹھی تھی۔ اچانک پردہ اٹھا کر سامنے آ گئی تھی۔

اینڈریا اس کے معمولات میں دوڑ جانے والی

اس نئی زندگی کی وجہ سمجھنے سے قاصر تھی۔
وہ اپنے اصل کی طرف واپس لوٹ رہی ہے یا کوئی نیا فیصلہ کر چکی ہے؟ کبھی اینڈریا کو لگتا وہ اپنے آپ سے لڑ رہی ہے اور کہیں وہ اس جنگ میں ہار نہ جائے مگر وہ اپنی خودشناسی کی یہ خوشی بھی زیادہ دن نہ منا سکی۔
جس شام وہ تزئین اظہر کے کمرے میں چائے کی پیالی پر طوفان اٹھا رہی تھی۔ اسے خیال آیا آج دو ہفتے ہو چکے تھے اس بار وہ شاید سچ مچ ہی بدگمان ہو گیا تھا۔ اس کی وہ آخری قہر بھری نظریں اسے یاد آئیں اور وہ بے سکون ہو گئی۔ ابھی کچھ دن ہوئے اس نے فیصلہ کیا تھا کہ اسے اب کسی سے کوئی امید نہیں رکھنی۔
وہ خود اپنا سرمایہ، اپنی متاع ہے لیکن وہ سخت نامہربان لمحہ تھا، جب اس سے آخری ملاقات کے سولھویں روز اس نے خود کو ہاسٹل نیلی سوزوکی وین کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے پایا۔
شہر کی بے ترتیب ٹریفک اور گولی کی طرح ایک دوسرے کا پیچھا کرتی زناٹے دار ویگنوں اور رکشے والوں کے بیچ اپنے راستے گم کرتی، ڈھونڈتی، وہ نیلا گنبد انارکلی پہنچی تھی۔ لدے پھندے راہ گیروں، ازار بند اور الاسٹک فروشوں کو گاڑی کی کمر سے بچاتی وہ لاہور کے اس بہت بڑے سرکاری اسپتال کے باہر ہراساں سی اتری تھی۔ چوکیدار کے پوائنٹ پر اس نے اندر جانے کی وجہ بتا کر پارکنگ کی پرچی لی تھی...... پھر بھی اسے پوچھ، پوچھ کر میو اسپتال کے شعبۂ دماغی صحت تک پہنچنے میں خاصا وقت لگ گیا۔

"معاف کیجیے...... کیا آپ میری رہنمائی کریں گے؟ مجھے ڈاکٹر فہد مرتضیٰ سے ملنا ہے۔" اس نے شعبے کے مصروف کاؤنٹر پر جھک کر اپنی طرف سے بڑی سلیس اردو میں بہت مؤدبانہ درخواست کی تھی۔ تب ہی سے رجسٹر پر جھکا ریسپشن پر کھڑا شخص کسی بہت ضروری مسئلے میں الجھا سخت مصروف تھا۔

اسے لگا، اس کی درخواست سنی نہیں گئی۔ کیونکہ وہ سر اٹھا کر چلایا تو اس کا مخاطب کوئی اور تھا۔

"چل اوئے تنویر...... لے کے جا اے بابے ہوراں نوں۔"

مصروف ریسپشنسٹ اس کے سر کے پیچھے جس پر چلایا تھا وہ اس کے ہی جیسا ایک اور مصروف وارڈ بوائے تھا اس نے دیکھا، وہ اس کے پیچھے آہستگی سے کھڑے ہونے والے ایک بوڑھے مریض کو کہیں اور لے جانے کی ہدایت دے رہا تھا۔ وارڈ بوائے نے حکم ملتے ہی مریض کے کندھے کو بازو کے حلقے میں لے کر وارڈ کے اس حصے کی طرف ہنکانا شروع کر دیا، جہاں ایک قطار میں لگے سفید بستروں پر مریض اور کرسیوں پر ان کے رشتے دار موجود تھے۔

سبرینہ کے پیچھے فرش پر فینائل میں بھیگا پوچھا لگایا جا رہا تھا۔ اس اتنے بڑے وارڈ کا ریسپشن ایریا کتنا مصروف ہوتا ہوگا اسے کچھ کچھ اندازہ ہو رہا تھا۔

اس نے اپنا سوال دُہراتے ہوئے اور ریسپشنسٹ کو اپنی طرف متوجہ نہ ہوتے دیکھ کر سوچا۔

"کیا اس کی بات سنی نہیں گئی...... یا سمجھی نہیں گئی؟"

اور آ ہی رہی تھی تو کیا تھا، ایک فون کر کے آئی ہوتی، اسے پہلے ہی اندازہ ہونا چاہیے تھا۔ اس نے سوچا کیسے کہ وہ فرصت سے بیٹھا اس کی راہ دیکھ رہا ہوگا پتا نہیں کیوں اس کو لگتا تھا کہ وہ اس کا منتظر ضرور ہوگا۔

وہ کتنی دیر اپنے چھوٹے مسئلے کے ساتھ بڑے مسئلوں میں گھرے اسپتال کے عملے کو مریضوں کے بیڈ اور تیمارداروں کو کرسیوں تک آتے جاتے دیکھتی رہی۔

"یہاں روز نت نئے لوگ آتے ہیں...... انہیں ہر روز ایسے چہرے دیکھنے کی عادت ہوتی ہے۔" وہ مایوس ہو کر کاؤنٹر سے ہٹ گئی۔

"ڈاکٹر فہد آج اسپتال میں نہیں ہیں۔" اس نے اپنی پشت پر جو فقرہ سنا وہ پنجابی لہجے کی انگریزی میں ادا کیا گیا تھا۔

"آج ان کی چھٹی ہے۔" ریسپشنسٹ اسی سے مخاطب تھا۔ اور اس کے بچے کھچے ارادوں پر ٹھنڈے پانی کی بالٹی الٹ چکا تھا۔

اس نے ڈھیلے ڈھالے شلوار کرتے میں ملبوس ایک غیر ملکی نظر آنے والی لڑکی کو سرسری نظر میں مایوس ہوتے دیکھا۔

"کیا آپ مریض ہیں؟" اس نے کچھ دلچسپی سے پوچھا تھا۔

وہ ابھی منہ کھولنے کا سوچ رہی تھی کہ اس نے مزید احسان کرنے کا فیصلہ کیا۔

"آپ کو اگر لازمی ان سے ملنا ہے تو آج کے دن وہ ڈیفنس کے ایک پرائیویٹ اسپتال میں مریض دیکھتے ہیں، دس سے دو بجے تک۔"

وہ شکریہ ادا کر کے اس پرائیویٹ اسپتال کا ایڈریس لے کر جب باہر نکلی تو اکتوبر کی دھوپ میں ذرا بھی نرمی نہیں تھی۔ گرم سورج کی تیکھی کرنیں بدلحاظی سے مریضوں کے لواحقین پر برس رہی تھیں جو اسپتال کے لان میں جا بجا چادریں بچھائے یہاں سے وہاں تک بکھرے پڑے تھے۔

پارکنگ والے لڑکے سے راستے کی الجھا دینے والی رہنمائی لے کر وہ اب اپنے آپ سے الجھتی پھر رہی تھی۔

"وہ کیوں آئی تھی یہاں؟ وہ کیا کرنے جا رہی تھی؟"

راستہ لمبا تھا۔ سڑکوں کے کنارے مسکراتے اشتہارات اور ڈاکٹرز کے پرائیویٹ کلینکس کی پیشانیوں پر نصب ناقابلِ فہم ڈگریوں والے بورڈز نے اسے کتنی بار پسپا کرنے کی کوشش کی۔ کتنی دفعہ اس نے اپنے آپ کو ڈپٹا۔

"کیا مصیبت آئی ہے، کیوں وہ اپنے لیے نئے مسئلے پیدا کرتے چلی ہے؟" لیکن وہ نہایت سہولت سے ڈیفنس لاہور کے مشہور اسپتال کے باہر، قیمتی مریضوں کی بیش قیمت گاڑیوں کے بیچ اپنے کالج کی پرانی سوزوکی ڈبا وین روک کر چابی پارکنگ ٹھیکدار

کے حوالے کر چکی تھی۔

یہ شہر کا ایک مہنگا پرائیویٹ اسپتال تھا۔ مریضوں کی خوشحالی، ان کے لباس سے ظاہر تھی۔ یقیناً ہوشیار ڈاکٹر، شہر کے رئیسوں کو یہاں وی وی آئی پی کمروں میں پُراسرار عارضوں سے نجات دلانے کے دعوے کرتے ہوں گے وہ اس کے بارے میں اتنے منفی انداز میں نہیں سوچنا چاہتی تھی لیکن اپنی یہ والی حرکت اسے بالکل پسند نہیں آئی۔ اسپتال کی چمکتی ٹائلوں والے فرش پر احتیاط سے قدم رکھتے اس نے ریسپشن کی ڈیسک پر رک کر وہی سوال دُہرایا جو ابھی گھنٹا ڈیڑھ پہلے ایک اور اسپتال میں پوچھا تھا۔

''میرا کوئی اپائنٹمنٹ نہیں ہے۔'' اس نے فرنٹ ڈیسک کی لڑکی کا اگلا سوال سننے سے پہلے آگاہ کیا۔

''لیکن مجھے ڈاکٹر فہد مرتضٰی سے ابھی، اسی وقت اور ضروری ملنا ہے۔ وہ مجھے جانتے ہیں۔'' اپنے آخری فقرے نے اسے خود بھی کچھ حیران کیا تھا۔

لڑکی نے اپنے پاس ہی کھڑے دوسرے ہم منصب سے کچھ مشورہ کیا...... پھر اپنے پیچھے دیوار کے کلاک کی طرف اشارہ کر کے بولی۔

''ڈاکٹر صاحب دو بجے تک مریض دیکھ رہے ہیں۔ اس کے بعد ان کا لنچ آور ہو گا تو میں انہیں بتا دوں گی۔''

دو بجنے میں آدھا گھنٹا ہی باقی تھا۔

ریسپشن کاؤنٹر پر کھڑی لڑکی اب کسی سے فون پر بات کر رہی تھی۔

''جی ڈاکٹر صاحب۔'' وہ بددل ہوئی۔

آخر وہ کیوں ایک نئی بے وقوفی کرنے کو بے صبری ہوئی جا رہی ہے۔ ''اچھا ہے وہ مصروف ہے۔''

''آپ کا نام......؟'' ریسپشنسٹ نے ریسیور کان سے لگائے لگائے چڑ کر پلٹتی اس لڑکی کو آواز دی تھی۔

ابھی ابھی جو لیکچر اس نے اپنے آپ کو دیا تھا اسے یاد کرنے کا ارادہ ملتوی کر کے وہ واپس آگئی۔

''سبرینہ گیبرئیل۔'' دوسری طرف سے جواب موصول کر کے اس نے ریسیور نیچے رکھا اور مسکرائی۔

''آپ اندر جا سکتی ہیں۔ ڈاکٹر فہد فری ہو گئے ہیں۔'' وہ مستعدی سے کھڑی ہوئی۔

''چلیں، میں آپ کو ان کے کمرے تک چھوڑ آتی ہوں۔'' خوب صورت گملوں سے سجے قیمتی پودوں کے درمیان رائٹ اور لیفٹ کی بھول بھلیوں سے گزرتی اسپتال کے شعبہ جات کی تختیاں پڑھتی ریسپشنسٹ ایک دروازے کے باہر اسے چھوڑ کر کب کی جا چکی تھی۔ وہ ایک ایسے نام کی تختی کے سامنے خوفزدہ کھڑی تھی جس کی تلاش میں وہ صبح سے پاگلوں کی طرح ماری، ماری پھری تھی اور اب بھی چاہتی تو واپس پلٹ سکتی تھی۔ ابھی کچھ نہیں بگڑا تھا۔

مگر ایک زبردست چرچراہٹ سے کھلنے والے دروازے نے اسے رنگے ہاتھوں پکڑ لیا۔ وہ دو مرد تھے اور ایک عورت...... ان میں مریض کون تھا، یہ پتا چلانا آسان نہیں تھا۔

اونچی آواز میں اپنے مریض کی حالت پر پریشانی کا اظہار کرتے آسودہ حال چہرے، وہ عجلت میں نہیں تھے پھر بھی کاریڈور کے آخری سرے تک پہنچ کر دائیں طرف کی راہداری میں غائب ہو چکے تھے۔ اس کی فرار کی شدید خواہش میں اٹھتی نظر ان کے قدموں کے تعاقب میں راہداری کے آخری سرے تک گئی پھر پلٹ آئی۔ اس نے دیکھا، اس پُراسرار خاموشی میں وہ اندر تک جھانک لینے والی دو خیر مقدمی آنکھوں کے سامنے ایک بہت مشکل مقام پر کھڑی تھی۔

وہ پورا دروازہ کھولے اس کے اندر داخل ہونے کا منتظر تھا۔ اچانک ہی عود آنے والے غصے کی ایک زبردست لہر کے ساتھ اس کا منہ تپ گیا۔ اس نے ایک جھٹکے سے سر اوپر کیا...... وہ سکون سے مسکرایا

جیسے اس نے اس کے اٹھے ہوئے سر کے پیچھے جاری سارا مکالمہ پڑھ لیا ہو۔

''اب تو آپ اندر آئیں گی۔''

اس کے چہرے پر ایک صاف ستھری مسکراہٹ تھی۔ اس نے دروازے سے ایک طرف ہٹ کر جیسے اپنے نئے مریض کو اندر آنے کا راستہ دیا تھا۔ اسے اپنا مرض تشخیص نہیں کرانا تھا۔ اندلدات تکیے پر سر رکھ کر بھی وہ کتنی دیر اپنے آپ کو یقین دلاتی رہی تھی...... وہ اس کی مریض نہیں لیکن اسے کسی لمبی وضاحت کی ضرورت نہیں پڑی۔ جیسے وہ جانتا تھا کہ وہ بس شکست کا اعتراف اس کے منہ سے سننا چاہتا تھا۔ تکیے پر سر رکھے رکھے وہ غصے سے بل کھاتی اٹھ بیٹھی۔

''کیا پوچھا تھا بھلا اس نے؟''

''کیا تم اب بھی اس کی قانونی بیوی ہو؟''

پین کو رائٹنگ پیڈ پر جھکا کر اس نے بڑی پروفیشنل لاتعلقی سے پوچھا تھا جیسے اسے یقین ہو کہ وہ بغیر شادی کے اتنے دن......

''ہونہہ......'' اس کا جی چاہا ایک زوردار تھپڑ رسید کر دے۔ اپنے اندر بھڑ بھڑ جلتی آگ کے گولے میں اسے جلا کر راکھ کر دے۔

''یہ کیسا ملک تھا، یہ کیسے لوگ تھے جنہیں شادی کے کاغذی معاہدے کے قانونی ہونے کی تو بڑی فکر تھی، دیواروں میں چنے زندہ انسانوں کی نہیں۔''

پھر اس نے اپنے آپ کو سرزنش کی۔

وہ فاروق فیروز کا دوست ہے۔ وہ آخر اس سے کیا سننے کی توقع رکھتی ہے؟'' اسے یاد نہیں، اس نے اپنے اوپر کیسے قابو پایا تھا۔ اسے یہ بھی یقین نہیں تھا کہاں تک جاننا، اس کے سامنے بیٹھے شخص کے لیے مناسب ہے اور کہاں تک نہ جاننا...... پھر بھی چند ادھورے اور نامکمل جملوں میں وہ اسے اپنی پوری کہانی سنا چکی تھی۔

فہد مرتضیٰ اپنے رائٹنگ پیڈ پر قلم جھکائے جان بوجھ کر اس کی طرف دیکھنے سے گریز کر رہا تھا۔

اسے اندازہ ہی تھا اسے بس یقین نہیں تھا۔

اگر وہ اب تک اسے کچھ بھی بتانے سے گریز کرتی رہی تھی تو اس کے پاس ایسا کرنے کی ہر وجہ موجود تھی...... اپنی شکستوں کے باپ گننا، انسان کے لیے بھی آسان نہیں ہوتا...... اور اتنی بلند و بالا لڑکی کے لیے تو بالکل بھی نہیں۔

وہ چپ ہو گئی تھی۔

''اب تم کیا چاہتی ہو...؟ انگلینڈ واپس جاؤ گی؟'' وہ پوچھ رہا تھا۔

اس نے بھونچکا ہو کر سر اٹھایا تھا۔ جیسے اس سے ایسے کسی سوال کی کبھی توقع نہ رہی ہو۔

''ہاں......'' اس کے حلق سے بے ساختہ نکلا......

''کہاں...... کس کے پاس؟'' یہ اس کے اپنے دماغ میں سوال اٹھا تھا۔

وہ دوبارہ بولی تو اس کی آواز کم مضبوط اور کم پُریقین تھی۔

فہد نے دیکھا، اس کے سوال نے اسے کتنی الجھن میں ڈال دیا ہے پھر جیسے وہ کسی نتیجے پر پہنچ گئی۔

''تو کیا...... میں یہ توقع رکھوں کہ تم میری مدد کرو گے؟'' فہد نے اپنے آپ کو اس کی اداس آنکھوں میں اچانک دوڑ جانے والی روشنی سے خائف ہوتا محسوس کیا۔

''بتاؤ فہد مرتضیٰ، کیا تم اپنے دوست کے خلاف اس کے گھر سے بھاگی ہوئی غیر مسلم، غیر ملکی بیوی کی مدد کرنا پسند کرو گے؟''

وہ جب سے ملے تھے اس نے پہلی مرتبہ اس کے منہ سے اپنا پورا نام سنا تھا۔ اپنی توقع کے برخلاف، ایک لمحے کے توقف کے بغیر اس نے خود کو کہتے سنا تھا۔

''ہاں، کیوں نہیں۔''

(باقی آئندہ)

ارلز کورٹ، لندن
چھبیس دسمبر 1987ء

وہ پچھلے کچھ عرصے سے اپنے باپ سے اس مسئلے پر بات کرنے کا ارادہ کر رہی تھی لیکن اسے اس کے ردِعمل میں اٹھنے والے طوفان کا اندازہ نہیں تھا۔
وہ کرسمس کی چھٹیوں پر گھر آئی تھی۔ اور اس کا باپ، اس کی بہن کے اقوامِ متحدہ کے ایک مشن کے ساتھ رضا کار ڈاکٹر کے طور پر جنگ زدہ علاقے

ناولٹ

تیسرا حصہ

کھوئے کھوئے لمحے

تابندہ نعیم

پاکستان کی انتہائی معتبر، انتہائی خوب صورت اور انتہائی کھرے جملے لکھنے والی مصنفہ رفعت ناہید سجاد کے انداز تحریر سے متاثر ہو کر شروع کی جانے والی یہ کہانی گزشتہ کئی سالوں سے ٹکڑوں کی شکل میں لکھی جاتی رہی۔ اس عرصے میں پاکستانی معاشرہ تبدیل ہو چکا ہے۔ اب پاکستان کے پبلک پارکس میں شاید ہی کوئی غیر ملکی خاتون پاکستانی طالبات کو شام کی تفریح کرانے نکلتی ہو... مگر ہمارے آپ کے اسی پاکستان میں کبھی ایسا ہوا کرتا تھا۔ کہانی فرضی ہے۔ اس کے واقعات سن انیس سو ستاسی سے انیس سو بچانوے تک کے حالات اور کرداروں پر مبنی ہیں، تاہم ان کی کسی حقیقی کردار یا واقعے سے مماثلت محض اتفاقیہ ہو سکتی ہے۔

میں روانگی کی خبر پر اداس تھا۔ ایما، غزہ جارہی تھی۔

پتا نہیں ایما کو ایسے خطرناک کام کرنے کا کیوں شوق تھا...... اور پتا نہیں اس کے بعد بھی وہ ایما اور ڈیڈی یوں اس طرح ایک جگہ اکٹھے ہوسکیں گے یا نہیں۔

اپنے طور پر تو...... اس نے دن اور وقت بھی بہت سوچ کر منتخب کیا تھا۔ ڈیڈی کھانے کی میز پر ایما کا اسپیشل ڈنر لگنے کے انتظار میں عربیک بریڈ کے ٹکڑے توڑ کر خاص اپنے لیے تیار کیے ہوئے حمس میں لگا، لگا کر کھا رہے تھے۔ ایما اوون کا دروازہ کھولے روسٹ میں چھری چبھو کر گوشت کے اندر تک پک جانے کا یقین کررہی تھی...... کھلنے والے اوون سے تقریباً تیار ہوجانے والے لیمب روسٹ کی خوشبو، لپٹیں بن کر اٹھ رہی تھی...... ایما اپنے خوابوں کے مشن پر روانگی سے پہلے اپنی ماں سے سیکھے امور خانہ داری کے تمام گُر آزمالینا چاہتی تھی۔ وہ جتنے دن یہاں تھی کم ازکم اتنے دن ان کے باپ کو اس کے ہاتھ کا پکا تازہ کھانے کو مل سکتا تھا۔ بعد میں تو وہ بازار کے تیار کھانے ہی گرم کرکے کھایا کریں گے۔

حالانکہ ساری عمر وہ دونوں اپنے باپ کے ہاتھ کا پکا کھا کر ہی بڑی ہوئی تھیں۔ ان کی ماں اینا بیلا کو پکانے کا شوق تھا...... لیکن اینا بیلا نے دیکھا تھا ان کا ریاضی دان شوہر جوزف گیبریئل اکثر اپنے الجھے ہوئے مضمون کی پیچیدگیاں لبنانی کھانوں کی ہوشربا مہک میں سہولت سے حل کرپاتا ہے۔ کوکنگ اس کی واحد راہِ فرار تھی۔ یعنی جہاں وہ تازہ دم ہوجاتا۔

چار سال ہوئے اینا بیلا ایک رات سو کر دوبارہ نہیں اٹھ سکیں۔

اب جوزف گیبریئل کو یقین تھا۔ ان کی زندگی کی کل کمائی ان کی بیٹیاں ہی ہیں۔ اینا بیلا کے بعد وہ دونوں باپ کے اور بھی قریب آگئی تھیں۔ وہ ان کے باپ کم اور دوست زیادہ تھے۔ اور انہیں بھی اپنی دونوں بیٹیوں پر فخر تھا۔

ایما نے کنگز کالج لندن سے ایمرجنسی میڈیسن میں ریزیڈنسی ختم کرلی تھی لیکن اسے شروع ہی سے ریڈ کراس اور ڈاکٹرز وِدآؤٹ بارڈرز جیسی تنظیموں کے اس کام نے متاثر کیا تھا جو وہ افریقا اور تنازعات کا شکار ملکوں میں لوگوں کی مدد کے لیے کرتی تھیں۔ ریزیڈنسی ختم ہونے سے کچھ ماہ پہلے عالمی ادارۂ صحت کے ایک رضا کار مشن کے لیے trauma physicians کی ضرورت کے اشتہار نے اسے اپنی خدمات پیش کرنے کا موقع دلوادیا تھا۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی، وہ کیا کررہی ہے۔

ایما کے غزہ جانے کا سن کر جوزف گیبریئل کا دل ڈوب گیا تھا لیکن وہ جانتے تھے کہ ان کی بیٹی اپنی اصلی مٹی کی طرف کھنچ رہی ہے۔ وہ زمین جسے جوزف گیبریئل نے کبھی اپنا نہیں سمجھا تھا، اس کے بارے میں خود فیصلے کرنا ان کی بیٹی کا حق ہے۔ انہیں یقین تھا کہ ان کی بیٹی اپنے لیے غلط راستے کا انتخاب نہیں کرے گی۔

جوزف گیبریئل کے آبا کا اصلی وطن لبنان تھا اور اصلی عقیدہ عیسائیت کی میرونائٹ کیتھولک شاخ۔ وہ ایک مزدور پیشہ لبنانی گھرانے میں پیدا ہوئے تھے۔ لبنان میں انیس سو اٹھاون کی خانہ جنگی سے کئی سال پہلے ہی جوزف گیبریئل کے والدین نے اپنے بہت سے ہم وطنوں کی طرح اپنے ذہین اور غیر معمولی بیٹے کے مستقبل کے لیے ترکِ وطن کا فیصلہ کرلیا تھا۔ یہ نقل مکانی شام سے مصر اور پھر سوڈان سے ہوتے ہوئے برطانیہ جاکر ختم ہوئی تھی۔ جوزف گیبریئل کا بچپن اور لڑکپن بیروت، دمشق، قاہرہ اور اسکندریہ کے تعلیمی اداروں میں گزرا تھا۔ انہوں نے اپنے ماں، باپ کو اپنے اچھے مستقبل کے لیے سخت جدوجہد کرتے دیکھا تھا۔ ریاضی کے مضمون میں ان کی غیر معمولی استعداد انہیں برطانیہ کے بہترین تعلیمی اداروں تک لے گئی تھی۔ جہاں پیچیدہ پرابلم کے حل ڈھونڈتے وہ طالب علم سے استاد بنے اور اب تحقیق کے کام میں عزت کمارہے تھے۔

اپنے شعبے کے کئی ماہرین کی طرح وہ کوئی ایک

مذہب پرست انسان ہو ہی نہیں سکتے تھے لیکن اچھے اور برے، صحیح اور غلط کی تمیز کرنا انہوں نے اپنے لبنانی والدین سے سیکھا تھا۔ وہ خاندانی اقدار پر یقین رکھتے تھے۔ مسلمانوں سے سماجی تعلقات ان کے بچپن کی خوشگوار یادوں کا حصہ تھے۔ اور یہی کشش ان کی دونوں بیٹیوں کو بھی محسوس ہوتی تھی۔ جن کے کئی اچھے دوست مسلمان تھے اور جن سے وہ اپنی بیوی اینابیلا کی زندگی میں اپنے گھر میں منعقد ہونے والی کئی چھوٹی موٹی تقاریب میں ملاقات کر چکے تھے۔ جوزف کو یقین تھا کہ ایما میں صحیح راستے کی پہچان کی صلاحیت موجود ہے۔

''ڈیڈی، میرے پاس بھی آپ کے لیے ایک سرپرائز ہے۔'' یہ سبرینہ تھی، ان کی چھوٹی بیٹی...... اس نے اپنی بڑی بہن کی خوشی پر راضی ہونے والے باپ کا دل بہلانے کو یونہی اپنے تھیلے سے کچھ برآمد کیا تھا۔ وہ یہ دیکھ کر دھک سے رہ گئی تھی کہ ابھی، ابھی اس کے باپ کی مہربان آنکھوں کی روشنی ایک دم بجھ گئی ہے اور لیموں کے تراشوں اور سلاد کے پتوں پر خوشبودار لیمب روسٹ سے بھی ڈش پیش کرتے ایما کے ہاتھ میز سے ہٹنا ہی بھول گئے ہیں۔

یہ ردِعمل اس کی توقع کے برعکس تھا۔

اس مختصر سی ڈائننگ ٹیبل کے گرد اتنی خاموشی چھا گئی تھی کہ وہ خوفزدہ ہوگئی۔

''کیا مجھے ایک گلاس پانی مل سکتا ہے؟'' جوزف گیبرئیل کی کمزور آواز نے اسے سخت صدمے سے دوچار کر دیا۔ وہ کس سے مخاطب تھے...... شاید کسی سے بھی نہیں۔ اس نے گھبرا کر ان کے چہرے کو غور سے دیکھا اور دنگ رہ گئی۔

انہوں نے ہمیشہ کی طرح اس کی پیٹھ نہیں ٹھونکی...... وہ کتنی باکمال بیٹیوں کے باپ تھے۔ وہ سر جھکائے خاموشی سے ایما کے محنت سے بنائے روسٹ کو چھری کانٹے سے کرید رہے تھے۔ انہیں بھوک نہیں رہی تھی پھر اس نے انتہائی صدمے کی کیفیت میں اپنے باپ کو بھنچا بھنچا ''ایکسکیوزمی'' کہہ کر میز سے اٹھتے اور ڈائننگ روم سے باہر جاتے دیکھا تھا۔ وہ اچانک ہی بوڑھے لگنے لگے تھے۔

ایما کسی مستعد میزبان کی طرح صورتِ حال کو سنبھالنے کی کوشش میں ہلکان ہو رہی تھی۔ آج اس کی ساری محنت بیکار... گئی تھی۔ وہ دم بخود سی میز کے کنارے اکیلی بیٹھی رہ گئی۔

''کیا اس نے کوئی غلطی کر دی ہے؟''

رات گئے جب وہ میز سے اٹھی تو اتنی مایوس نہیں تھی۔

''وہ انہیں منا لے گی، انہوں نے آج تک ان کو کسی بات سے منع نہیں کیا۔''

لیکن ڈیڈی کے مان جانے کے کوئی ارادے نہیں تھے۔

وہ جو دنیا میں ہونے والے ہر واقعے کی کوئی سائنسی توجیح، اعداد کی جمع تفریق سے نکال سکتے تھے۔ اس مسئلے کے کسی بھی پہلو کو اس کی آنکھ سے دیکھنے پر آمادہ نہیں ہو رہے تھے اور وہ لندن یونیورسٹی کے رائل ہالووے اسکول آف میتھ میٹکس کے پروفیسر ہونے کے ساتھ ایک باپ بھی تھے۔ اور اس کی خودسر آنکھوں میں ابھرتے چیلنج کے نتائج بہت دور تک دیکھ رہے تھے۔ وہ اپنی بیٹیوں کی انفرادی آزادی کے حق میں تھے لیکن انہیں یقین تھا کہ اس فیصلے کا انجام اچھا نہیں ہوگا۔ سارے دن کی بحث کے بعد وہ اس کے پاس سے اٹھے تو اور بھی دلگرفتہ اور متفکر تھے۔

اسے ان کی ناراضی بالکل ناجائز لگتی، بے جا ضد...... وہ انہیں کیسے سمجھاتی وہ اب بڑی ہوگئی ہے۔ سارا ایڈنبرا اس کے خیالات کی قدر کرتا ہے اور وہ جو تمام زندگی دوسروں کو ان کی مرضی کے خلاف چلانے سے منع کرتے آئے ہیں جو بنیادی انسانی حقوق اور انسانی مطابقت کے فلسفے کے علم بردار ہیں۔ وہ کیوں اس کی بات سمجھنے کی کوشش نہیں کر رہے؟

وہ اتنی ضدی سی ہو رہی تھی کہ ایما کو اس سے بات کرتے خوف آ رہا تھا۔

ان دنوں پکاڈلی سرکس میں ہولناک آتش زدگی ہوئی تھی، ایما سولہ، سولہ گھنٹے اسپتال میں لگا کر آتی پھر بھی اس کے پاس بیٹھ کر اسے سمجھانا نہیں بھولتی تھی۔

''تم اسے کچھ وقت تو دو...... اسے آزما تو لو...... دیکھو کوئی جلد بازی مت کرنا۔'' کبھی وہ کہتی۔

''تم ان میں سے نہیں ہو سبرینہ...... تم ان کے بارے میں کچھ نہیں جانتیں...... ہو سکتا ہے تمہیں مسلمان ہونا پڑے۔''

کبھی وہ اسے جذباتی بلیک میل کرنے کی کوشش کرتی۔

''میں اگلے کچھ مہینوں میں چلی جاؤں گی تو ڈیڈی کتنے اکیلے ہو جائیں گے، تم قریب رہو گی تو... کم از کم انہیں تسلی تو رہے گی۔'' ایما نے اسے سوچ میں ڈوبا دیکھ کر کہا تھا اور اب غصے سے اکھڑتا دیکھ رہی تھی۔

''کیوں، میں ہی کیوں سوچوں، تم کیوں نہ سوچو...... تم نہیں جا رہیں انہیں چھوڑ کر؟ تم تو یہ بھی نہیں کہہ سکتیں کہ تم زندہ واپس آؤ گی یا نہیں...... تمہیں تو نہیں روکا انہوں نے۔'' اس کے انداز میں کس قدر بدگمانی تھی۔ ایما کچھ دیر صدمے کی زیادتی سے کچھ بول نہیں سکی پھر کہنے لگی۔

''اچھا تم اپنے مستقبل کا سوچو، تمہارا ریسرچ کا خواب، تمہارا پی ایچ ڈی کا خواب، تمہیں دوبارہ ایسا موقع نہیں ملے گا۔''

''نہیں چاہیے مجھے ایسا موقع...... مجھے اس کام میں کوئی دلچسپی نہیں۔'' اس نے ایما کو ہکا بکا کر دیا تھا۔

''شاید واقعی ڈیڈی کے انکار نے اسے اتنا ہرٹ کر دیا ہے۔'' نئے سال کا پہلا دن فیصلے کا دن تھا۔ اتنے دنوں سے گھر میں جو تناؤ جاری تھا ڈھیلا پڑ گیا۔ اس نے ڈیڈی کے طویل لیکچر کے جواب میں کہا تھا۔

''آپ مجھے خوش نہیں دیکھنا چاہتے۔''

جوزف گیبرئیل اس کی آنکھوں میں اتری سرکشی دیکھ کر دنگ رہ گئے...... کون تھا وہ جس نے اسے اس حد تک جانے پر مجبور کر دیا تھا؟ اس کے بعد انہوں نے کچھ نہیں کہا۔ جیسے اب ان کا اس معاملے سے کوئی واسطہ نہیں رہا ہو۔

یہ ان کے گھر کی سب سے ناخوشگوار کرسمس تھی جو ختم ہو گئی تھی۔

''ڈیڈی، دراصل ایک پتھر دل راہب ہیں، وہ اپنی بیٹیوں کو نن بنا دیکھنا چاہتے ہیں۔'' حالانکہ اس ایک واقعے سے پہلے اس نے کبھی اتنے منفی انداز میں اپنے باپ کے بارے میں نہیں سوچا تھا۔

اسے صبح صبح روانہ ہونا تھا ابھی تک وہ بستر پر بیٹھی ایما کے ساتھ ہوئی شام کی جھڑپ پر غصے میں بل کھا رہی تھی۔ کیا تھا جو وہ ایک بار اس پر اعتبار کر کے دیکھ لیتے۔ اسے رونا آ گیا۔

اس کے کچھ کپڑے ایما کی الماری میں تھے لیکن ایما کے کمرے کی روشنی بجھی ہوئی تھی۔ شاید وہ سو چکی تھی۔ وہ پلٹنے کا سوچ رہی تھی لیکن اسٹڈی سے باہر آتی آوازوں نے اس کے قدم پکڑ لیے۔ وہ بے دھڑک دروازہ دھکیل کر اندر داخل ہوئی۔ اوندھی پڑی بوتل کے پاس گلاس میں لبالب بھرا مشروب چھلک کر میز کے شیشے سے بہتا ہوا نیچے قالین میں جذب ہو رہا تھا۔ وہ سفید بالوں والا سر، شکنوں سے بھری پیشانی، کسی نامعلوم بوجھ سے ڈھلک جانے والے کندھے...... وہ آخر اپنا کیا کچھ ہار کر بیٹھے تھے...... کوئی اسے بھی تو بتاتا۔

ایما کے اجلے ہاتھ، محبت سے ان کی پیٹھ سہلا رہے تھے، وہ آہستہ، آہستہ ان کے کان میں کیا کہہ رہی تھی۔ سبرینہ کچھ بھی سمجھنے سے قاصر تھی۔

مگر وہ یہ جانتی تھی کہ جس دن اس کے باپ کے دل کی دھڑکن پہلی بار بے ترتیب ہوئی اس کی میڈیسن پڑھنے والی بہن نے اس گھر میں ہر اس چیز پر پابندی لگا دی تھی جو سیال تھی۔ یاد ھواں...... شاید وہ ان کے قریب چلی جاتی شاید وہ ان کا حال پوچھتی اگر وہ ایما کو یہ کہتے ہوئے نہ سن لیتی۔

''میں آپ کو چھوڑ کر نہیں جاؤں گی۔ لیکن آپ اسے مت روکیں۔ وہ تجربہ کرنا چاہتی ہے اور شاید فیصلہ کر چکی ہے۔''

اس کا دل بیٹھنے لگا۔ اس کا جی چاہا وہ ایما کو زور کا چانٹا لگا دے آخر اسے کیا حق ہے اس کے باپ کو اس سے بدگمان کرنے کا۔ وہ ہوتی کون ہے؟ لیکن وہ ایک انچ بھی اپنی جگہ سے ہل نہ سکی۔ وہ دو قریبی لوگوں کی آپس کی بات تھی۔ وہ ان کی اکائی کیسے توڑتی۔

''فکر مت کریں، وہ خوش رہے گی آپ اسے جانتے نہیں؟'' ایما کی کمزور تسلی میں یقین کا کس قدر فقدان تھا، وہ اس کا چہرہ دیکھے بغیر بھی جانتی تھی۔

اس کی آنکھوں میں پانی بھرنے لگا۔ اس کا ارادہ کسی کو نیچا دکھانے کا نہیں تھا۔ پتا نہیں، انہوں نے اسے اس کی ضد کیوں سمجھ لیا ہے۔ وہ ایک لفظ بولے بغیر کمرے سے باہر آگئی۔

وہ ساری رات جاگی تھی پھر بھی صبح کے نزدیک اس کی آنکھ لگ گئی۔ الارم کی آواز پر جاگی تو کمرے کے پردوں کے پیچھے اندھیرا ابھی مکمل طور پر چھٹا نہیں تھا۔ اس نے بددلی سے بستر چھوڑ دیا۔ نیند کی کمی کو نیم گرم پانی میں بہا کر وہ باہر آئی۔ کپڑے بدلے اب وہ روانگی کے لیے تیار تھی۔

لیکن ہاں، وہ آخری دفعہ ڈیڈی کی بدگمانی دور کرنے کی ایک کوشش تو کر سکتی ہے۔ اس نے ان کے کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے کچن میں جھانکا جہاں ایما تیز، تیز ہاتھوں سے انڈے پھینٹ رہی تھی۔ اس کی صبح کی شفٹ تھی۔ وہ ساری عمر ایما کے نظم وضبط اور سلیقے پر حیران ہوتی آئی تھی۔ اس نے ماں کے جانے کے بعد اس گھر کو ان کی کمی محسوس نہیں ہونے دی تھی۔ ایک مصروف ڈاکٹر، ایک مہربان بیٹی، ایک دوستوں جیسی بہن..... پتا نہیں وہ اتنی مکمل کیسے تھی۔

سبرینہ کچن کے دروازے سے ہٹ آئی۔

''لیکن ڈیڈی اس سے ناراض بھی تو نہ ہوں ناں..... اس نے کون سا فیصلہ کر لیا ہے۔'' وہ دیانت داری سے ارادہ کر کے باپ کے کمرے کی طرف بڑھی تھی اور اس کے قدم ایما کی آواز پر پتھر ہو گئے تھے۔

''وہ ساری رات جاگ کر ابھی سوئے ہیں، پلیز تم اندر مت جاؤ۔'' خشک آواز، ناراض لہجہ.....

اس نے بدگمانی کی زبردست لہر کو خود پر چڑھتے محسوس کیا۔ اس کی اکلوتی بہن سرد مہری کا ہر رنگ پہنے بہت مصروف دکھائی دینے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ آہستگی سے کچن میں آگئی۔ کاؤنٹر کے قریب پڑے اونچے اسٹول کے پاس پہنچ کر اس نے ایما کی مصروف اور ناراض پشت کو غور سے دیکھا تھا۔

ایما نے پھینٹے ہوئے انڈے کا آمیزہ فرائنگ پین میں ڈال کر اس میں کٹا ہوا پنیر گرانا شروع کر دیا تھا۔

سبرینہ نے ریفریجریٹر کا دروازہ کھول کر پیالے میں دودھ انڈیلا اور کارن فلیکس ڈالا اور ناشتا کرنے لگی۔

وہ ایما کے اگلے سوال کی منتظر تھی لیکن ایما کو اس کے کچن میں آبیٹھنے سے کوئی غرض نہیں لگتی تھی۔

اس نے ٹھنڈے دودھ میں اکڑے ہوئے کارن فلیکس چباتے اس کی لاتعلق نظر آنے والی پشت پر غور کیا۔ ایما کا چھوٹے، چھوٹے پیلے پھولوں والا نیلا ایپرن بالکل اکڑا ہوا تھا، اس کے چہرے کے ہر تاثر کی طرح بے شکن اور ناقابلِ فہم، وہ ایما کی نصیحتوں سے ہمیشہ چڑتی آئی تھی لیکن آج اسے لگا اس کا دل کہیں ڈوبتا جا رہا ہے۔ اس نے یونہی کوئی بات کرنے کی غرض سے چمچ کو پیالے میں گھما کر چھوڑ دیا۔

''میں ان سے ملے بغیر نہیں جانا چاہتی۔''

''وہ بہت مشکل سے سوئے ہیں۔ ان کی طبیعت ٹھیک نہیں۔'' ایما کا جواب واضح تھا، اس کی تنی ہوئی پشت پر اس ملاقات سے انکار پڑھنا بالکل مشکل نہیں تھا۔

''تم جلدی کرو، تمہاری ٹرین نکل جائے گی۔''

وہ سچ مچ سہم گئی..... یہ ایما کے لہجے میں کتنی اجنبیت تھی۔

''تم کہاں جا رہی ہو، تم کچھ نہیں کھاؤ گی؟'' اس نے ایما کے کچن سے نکلنے کے ارادے میں حائل ہونا چاہا تھا اور ناکام رہی تھی۔

''نہیں، مجھے جلدی اسپتال پہنچنا ہے۔'' وہ

کاؤنٹر کے کنارے اکیلی بیٹھی خود کو بہت ہی فالتو لگی۔
اس نے کبھی سوچا نہیں تھا...... ایما در اصل اس سے کبھی ایسی ناراض نہیں ہوئی تھی۔ ساری عمر اس نے اسے احتیاط سے چلنے کے سبق پڑھائے تھے لیکن ساری عمر وہ سبرینہ کے ہر خطرناک کھیل میں اس کے ساتھ شریک رہی تھی۔

''پھر آج کیا نیا ہوا ہے؟'' اس کے پاس فرصت سے بیٹھ کر صورتِ حال پر غور کرنے کا وقت نہیں تھا۔

وہ اپنا بیگ گھسیٹ کر سیڑھیوں سے نیچے لائی مگر ڈیڈی کے کمرے کے بند دروازے کے باہر ذرا دیر کو رکی ضرور۔

''کیا واقعی ایما نے سچ بولا ہے اگر وہ اندر چلی جائے تو؟''

اس کی توقع کے بالکل برخلاف، ایما کہیں سے نکل کر آئی تھی۔ وہ اسی لباس اور ایپرن میں تھی۔ یعنی وہ صرف اس کے ساتھ بیٹھنے سے بچنے کے لیے کچن سے فرار ہوئی تھی۔

اس کے اٹھتے قدم سست اور پھر تیز ہوئے اس نے نقصان کے گہرے احساس کے ساتھ اپنے گھر کے بیرونی دروازے کا ہینڈل چھوا تھا اور اس کے صدمے کی انتہا نہ رہی جب ایما کو اس نے اپنے پیچھے دروازہ بند کرنے کے لیے تیزی سے لپک کر آتے ہوئے پایا۔

دروازہ کھلتے ہی یخ بستہ ہوا کا تیز جھونکا خوب گرم اور آرام دہ گھر میں داخل ہوا تھا۔ اپنا پاؤں دروازے کی دہلیز سے باہر رکھتے اسے زبردست پھریری آگئی۔ وہ اپنی ایڑیوں کے بل پر پلٹی تھی۔

''ایما......؟ تم۔'' وہ اٹک گئی۔ وہ خود بھی نہیں جانتی تھی وہ کیا کہنا چاہتی ہے اور کیوں......

''ڈیڈی سے کہنا میں......'' پھر جیسے ڈیڈی کو کچھ بھی پیغام دینے کا خیال بالکل بے معنی لگا...... وہ ایما کی غیر محبت بھری نظروں کے سامنے خاموش کھڑی رہ گئی۔

ایما کو شبہ تھا وہ کچھ تو کہے گی، کوئی یقین دہانی، کوئی تسلی دیتا جملہ، کوئی امید دلاتی بات...... لیکن اس کے ہونٹوں سے ادا ہونے والے اگلے الفاظ نے اسے مایوس کر دیا۔

''اچھا ایما......'' وہ جیسے بہ مشکل مسکرائی۔ ''میں ایسٹر بریک پر شاید نہ آؤں۔'' ایما صدمے کی زیادتی سے چور، چور تھی۔ اسے پتا تو تھا پر اسے یقین نہیں تھا۔

''خیریت سے جاؤ۔'' ایما نے کہا تو اسے لگا جیسے کہتی ہو۔ ''خبردار جواب واپس آئیں۔'' سبرینہ کو لگا اگر اس نے فوری قدم باہر نہ نکالے تو ایما اس کے رخصت ہونے کا انتظار کیے بغیر دروازہ بند کر لے گی۔ اس کے اپنے گھر کا دروازہ...... وہ ایک لفظ کہے بغیر باہر نکل گئی۔

اس کے باہر نکلتے ہی دروازہ ہوا کے زبردست دباؤ سے اس سے بھی زیادہ زوردار آواز سے بند ہوا جتنا ایما کا ارادہ تھا۔ اور دروازے کے ساتھ سبرینہ گیبرئیل کا دل بھی...... سیاہ بادلوں میں چھپا آسمان برس پڑنے کو بے تاب تھا۔ ٹھنڈی یخ ہوائیں، درختوں کی ننگی شاخوں پر شور مچاتی پھر رہی تھیں۔ وہ اپنے گرمائش بھرے گھر کے ٹھنڈے یخ بند دروازے کے باہر اس برف سی خالی اور تنہا سڑک پر بالکل اکیلی کھڑی تھی۔ اسے صورتِ حال کی یہ سنگینی بالکل پسند نہیں آئی۔

کچھ دیر کو اسے لگا وہ کمزور پڑتی جا رہی ہے اور اسے کمزور ہی تو نہیں پڑنا تھا۔ اس نے اپنی ابل پڑنے کو بے تاب آنکھیں رگڑ ڈالیں۔ اسے کنگز کراس اسٹیشن سے آٹھ بجے کی ٹرین پکڑنی تھی اور آج یقیناً اس کی ٹرین چھوٹ جانے والی تھی۔ وہ ثابت قدمی سے اپنا سوٹ کیس برف سے ڈھکے فٹ پاتھ پر گھسیٹتی رہائشی مکانوں کی لین عبور کر کے مین روڈ پر آئی تھی اور ٹیکسی روک کر سامان رکھتے اس نے ایک فیصلہ کیا تھا۔

''وہ اتنی کمزور نہیں کہ ایسی معمولی رکاوٹوں سے حوصلہ ہار جائے۔'' اس یخ بستہ شام کو اپنے اپارٹمنٹ کے دروازے میں چابی گھماتے بھی وہ یہی سوچ رہی تھی۔

☆☆☆

لیکن شاید یہ اس کے ارادے کی کمزوری تھی کہ

واپسی کے چند دنوں میں اسے اندازہ ہوگیا...... ارادے کرنا اور ان پر عمل کرنا، دو مختلف باتیں ہیں...... وہ اپنے باپ اور بہن کی محبت کے بغیر زندہ نہیں رہ پائے گی۔

یہ ماسٹرز کا آخری سمسٹر تھا۔ لائبریری سے کتابیں نکلواتے، واپس کرتے، اپنے تھیسز کو آخری شکل دیتے، اس کا ذہن جیسے اسی ایک نکتے کو سلجھا، سلجھا کر تھک گیا تھا۔ اس کے استاد حیران تھے۔ وہ نالائق طالبہ لگنے لگی تھی۔ پڑھائی سے جی چرانے والی، کام نہ کرنے کے بہانے ڈھونڈنے والی۔

''کیا حرج ہے، اگر وہ ڈیڈی کی بات مان لے، حالانکہ......'' اس کے اندر سے پھر احتجاج کی آواز بلند ہوئی۔

''ڈیڈی کو اب اس کی زندگی میں اس حد تک دخل اندازی بند کردینی چاہیے۔'' پھر وہ سوچتی۔

''یہ کتنی بڑی حماقت ہے...... وہ ایک نئی چوٹی سر کرنے کے شوق میں کیا کرنے جارہی ہے۔ ایما ٹھیک کہتی ہے۔ وہ اس کی دنیا نہیں...... زندگی ایسے تجربات کا بوجھ نہیں اٹھاسکتی۔''

مگر اس سے پہلے کہ وہ اپنے عجیب و غریب ایڈونچر سے دست برداری کا اعتراف کرتی۔ ایما کو فون کرتی...... وہ واپس آگیا۔

☆☆☆

22 جون 1989ء

وہ جولائی کی گرم ترین دوپہر تھی۔

اس کے کمرے کا پنکھا آگ برساتے، برساتے کتنی دیر پہلے لوڈشیڈنگ کی زد میں آگیا تھا۔ پسینہ کبھی اس کے سر کے بالوں سے بہتا اس کی گردن بھگوتا اور کبھی کمر پر سانپ کی طرح رینگتا، ایڑیوں تک بہتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔

اس نے زمین سے چھت تک تنا بھاری پردہ ہٹادیا۔ کھڑکی کی موٹی گرل کے باہر غصے میں لال پیلا ہوتا سورج کائنات کی ساری تمازت، ایک ساتھ انڈیل رہا تھا جھلسا دینے والی دھوپ کے نیچے آم اور امرود کے درختوں کے جھنڈ، کیاریوں میں جھلسے پودے اور لان کی سوکھی خشک گھاس جیسے سب کاربن ڈائی آکسائڈ کی زیادتی اور گرمی کی مار سے کمھلا گئے ہوں۔

اس نے کھڑکی کا شیشہ کھول کر، گرم لو کے تھپیڑوں کو اندر آنے کا راستہ دیا...... ہوا کے گرم تھپیڑے نے لمحے بھر کو پسینے سے تربتر اس کی قمیص کو چھوا اور ہلکی سی ٹھنڈک کا احساس پیدا کرکے گزر گیا۔

سردی، گرمی، دھوپ، چھاؤں جیسے قدرتی عوامل ایک عرصہ پہلے اس پر اثر انداز ہونا بند ہوگئے تھے۔

زندگی اگر سکون سے چلتے، چلتے اچانک شعلوں کی زد میں آجائے...... انا، خودداری اور عزتِ نفس جیسے لایعنی الفاظ، دن رات کے بے معنی تعاقب میں کہیں دم سادھ کر بیٹھے ہوں اور ہر آتی جاتی سانس بقا اور فنا کے درمیان تنی ہوئی وہ رسی بن جائے جس پر چلنے والے کا کسی بھی لمحے منہ کے بل گرجانا یقینی ہو تو انسان اپنی جبلت میں موجود بقا کی بنیادی خواہش اور ضبطِ نفس کے درمیان کے سارے سمجھوتے خود بخود کرلیتا ہے۔

اس کا محبوب اپنے اونچے محل کی سب سے اوپری منزل پر...... آگ برساتے کمرے کے بند اے سی کو دیکھ کر ہنسا تھا اور اس نے کہا تھا۔

''آسائشوں سے منہ پھیر کر ہم ان کا کیا نقصان کرتے ہیں...... یہ رعایت تب تک ہے، جب تک تم کوئی فیصلہ نہیں کرلیتیں...... تم اتنی بے وقوف نہیں ہوسکتیں۔ یہ میں جانتا ہوں۔''

اس کا چہرہ پسینہ، پسینہ تھا۔ اس نے ہاتھ کی پشت سے پسینہ پونچھنا چاہا، لیکن رک گئی۔ اس کی کھڑکی کی گرل کے پار دور درختوں کے جھنڈ کے پیچھے سے وہ اچانک ہی نکلی تھی۔ اور اب آم کے ایک گھنیرے درخت کی طرف جارہی تھی، جس کے سائے میں نیچے موسمی پھولوں کے ننھے پودے ابھی اگنے شروع ہی ہوئے تھے۔ اس نے اپنی مٹیالے رنگ کی چادر سر پر مزید آگے کھینچ کر ارد گرد دیکھا تھا پھر کیاری کے سرے پر ایڑیوں کے بل بیٹھ کر دلجمعی سے کچھ اکھاڑنے لگی

تھی۔ شاید فالتو جڑی بوٹیاں......

سبرینہ نے پہلے بھی اسے چلچلاتی دوپہر میں آم کے درختوں کے پیچھے سے برآمد ہوتے اور کیاری، کیاری جھک کر پھولوں، پودوں اور پتوں کا حال پوچھتے دیکھا تھا۔ وہ رکتی پھر جھکتی پھر اٹھ جاتی۔ سر سے پاؤں تک ایک بڑی سی چادر میں لپٹی اس عورت کے ہاتھ میں، ہمیشہ جڑی بوٹیاں اکھاڑنے والی کوئی چیز ہوتی تھی۔ پتا نہیں وہ مالکوں میں سے تھی یا نوکروں میں سے...... سنسان گرم دوپہروں میں چلچلاتے سورج کے نیچے بے قدر لوگوں کی کھیتیاں ہری رکھنے کے جتن میں مگن کتنی دیر تیز، تیز ہاتھ چلانے کے بعد اس نے جیسے تھک کر ہاتھ میں پکڑا اوزار پھینک دیا اور ستانے کے انداز میں سوکھی زرد گھاس پر بیٹھ کر چادر سے خود کو پنکھا جھلنے لگی۔

اس کے انداز میں ایک الگ سی تمکنت تھی۔ اس کا دور سے نظر آتا چہرہ جیسے طویل مسافتوں کی دھوپ سہہ کر بھی پوری طرح سنولایا نہیں تھا۔

گو وہ اس سے بہت دور تھی اور اتنے فاصلے سے اس کا چہرہ صاف دکھائی بھی نہیں دے رہا تھا پھر بھی اسے لگا کہ جب وہ دھیان سے بیٹھی ہاتھ کی لکیروں کو، زمین کی بے رس گھاس کو، درخت پر غل مچاتی چڑیوں کو دیکھ رہی تھی اس نے ایک نظر اٹھا کر سامنے کھڑی اس تاج محل جیسی عمارت کی سب سے اوپر والی منزل کو بہت غور سے دیکھا تھا۔ وہی کچھ سوچتی نظر سبرینہ کے کمرے کی کھڑکی پر بھی پڑی تھی اور گزر گئی تھی۔

سبرینہ کو شک ہوا کہ اس نے کھڑکی کے شیشے کے پیچھے لوہے کی گرل کے پار جالی سے چہرہ لگائے اسے ضرور دیکھا ہے۔ وہ اداس سی پلٹتی نظر جیسے کسی موجودگی کے احساس سے چونک کر دوبارہ اس کھڑکی تک واپس آئی اور ٹھہری تھی کتنی دیر وہ اس کھڑکی کو دیکھتی رہی۔

پھر سبرینہ کو لگا وہ اسے نہیں دیکھ رہی تھی۔ وہ کہیں دور کچھ اور دیکھ رہی تھی۔ پتا نہیں وہ ایسی جھلسا دینے والی دوپہروں میں درختوں کے نیچے بیٹھ کر کون سی ریاضتیں حاصل کرتی تھی۔

پھر جیسے وہ ہوش کی دنیا میں اچانک آئی اور... ہڑبڑاتی ہوئی کھڑی ہوگئی...... جیسے آج سے پہلے وہ کبھی اتنی بے خبری سے یہاں اتنی دیر آکر نہ بیٹھی ہو...... تاخیر ہوجانے کی گھبراہٹ تیز، تیز قدموں میں لپٹی اس کی واپسی کی رفتار سے نمایاں تھی...... وہ درختوں کی اوٹ میں غائب ہوچکی تھی۔ وہ اکثر اسی طرح غائب ہوجاتی۔

وہ کھڑکی سے ہٹ گئی۔ اس پُر اسرار محل میں، اپنے نادیدہ گناہ کی سزا کاٹتے، اسے ابھی کئی صدیاں نہیں گزری تھیں۔ پچھلے ایک سال میں اس نے کئی بار زندگی کی اس پلٹ جانے والی بازی کا دوسرا سرا ڈھونڈنے کی کوشش کی تھی۔ کئی بار اس کا پچھتاوؤں میں ڈوبا دل اس سے بے رحم کھیل کھیلنے لگتا۔ اگر اس روز اس نے ایما کی سرد مزاجی پہ لڑائی کرنے کا فیصلہ کیا ہوتا...... اگر اس دن برفباری رکتی ہی نہیں...... اگر اس کی ٹرین چھوٹ جاتی یا ٹرینیں ایک دن کے لیے ایڈنبرا جانا بند ہوجاتیں۔ لیکن واقعہ یہ تھا کہ ایسا ”اگر“ دوبارہ اس کی زندگی میں کبھی آنے والا نہیں تھا۔

یہ نئی دنیا، جہاں فاروق فیروز خان اور اس کے طاقتور باپ اور بھائیوں کی حکومت تھی۔ ابھی دریافت کا سفر طے کر رہی تھی اور پتا نہیں کتنا سفر باقی تھا۔

بجلی آگئی تھی...... پنکھا چل گیا تھا۔ پسینہ سکھانے کے لیے تو کافی ہی تھا کم از کم...... وہ کہاں، کہاں کا سفر کر کے لوٹی تھی۔

☆☆☆

ایسی ہی ایک سنسان دوپہر تھی جب وہ اپنے کمرے کی بند کھڑکی کے باہر دور کسی مشین سے ایک تواتر سے بلند ہوتی کو، کو کی مسلسل آواز سن رہی تھی۔

”اچھی“ کے مطابق یہ گیہوں پیسنے والی چکی کی آواز تھی جو صرف رات کو ہی کام کرنا بند کرتی تھی۔ اس آواز کی عادی ہوجانے کے باوجود وہ اتنی سخت چڑ گئی تھی کہ اسے ایما کے خط ملنے کی خبر نے بری طرح جذباتی کردیا۔ فضائی ڈاک سے موصول ہونے والا خط فاروق

کے ملتان والے ایڈریس پر بھیجا گیا تھا۔ یہ وہی ایڈریس تھا جو سبرینہ نے ایڈنبرا چھوڑتے ہوئے ایما کو لکھے اپنے آخری خط میں بھیجا تھا۔ اسے لگتا تھا کہ کبھی نہ کبھی تو وہ اس رہائش گاہ پر دنیا کے سب سے بہترین اور ذہین، ترقی پسند آدمی کی محبوب بیوی بن کر رہے گی۔

ایسا بھلا کہاں ہو سکا تھا......؟ وہ جس جگہ قید تھی، وہ اس کی دنیا کی سوچ سے دور، ایک ایسا علاقہ تھا جہاں اس کے پچھلوں کا گمان بھی نہیں پہنچ سکتا تھا۔

وہ اپنی چمکدار، مہنگی امپورٹڈ گاڑی سے اتر کر چمکتے فرش روندتا، دبیز ایرانی قالینوں کو پاؤں کی ٹھوکروں کے نیچے کچلتا، کمرے میں آیا تو سخت بپھرا ہوا تھا۔

اس آہنی قلعے میں جہاں چڑیا پر نہیں مار سکتی، آسمان تک اونچی موٹی دیواروں میں چنی ذرا سی لڑکی کو اتنی جرأت کیسے ہوئی کہ اپنے پیچھے مڑ کر دیکھنے کی ہمت کرے۔

''کیا سمجھتی ہے وہ فاروق فیروز خان کو؟ آخر وہ شے کیا ہے؟'' غضب کی شدت سے بلند ہوتی آواز میں، رعونت بھری بدتمیزی سے چلاتا، وہ جو منہ میں آیا بولتا چلا گیا تھا۔

وہ سہم کر دیوار سے لگی کھڑی تھی۔

وہ ''شے'' نہیں ہے، یہ نکتہ اٹھانے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔

وہ اپنے متکبر دماغ کی ساری گندگی، اس کے منہ پر الٹ کر پاؤں پٹختا باہر نکل گیا تھا۔

اس نے اس کے جانے کے بعد سر اٹھایا۔

اس بڑے ڈیل ڈول والے طاقتور شخص کو ذرا سا کانٹا چبھو کر اس نے پہلی بار جانا تھا کہ ہاتھی اور چیونٹی کی لڑائی میں جیت چیونٹی کی کیونکر ہو سکتی ہے۔ مگر وہ اس انوکھی مسرت سے زیادہ دیر لطف اندوز نہیں ہو سکی۔

اس نے دیکھا جو لفافہ اس کے گھر سے آیا تھا۔ اس شخص کی وحشت کا شکار ہو کر پرزے، پرزے ہوا قالین پر بکھرا پڑا تھا۔

اس نے بے ساختگی میں جھک کر، وہ ان گنت پرزے سمیٹے۔ محبت سے جوڑ کر پڑھے اور اپنی جگہ سے ہل

نہیں سکی۔ ایما کی ہینڈ رائٹنگ پہچاننے کے باوجود اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ جو اس نے پڑھا ہے وہی درست بھی ہے۔

وہ یہاں آنے کے بعد ابتدائی چند دنوں کے سوا ہر روز روئی تھی مگر اس بری طرح اتنی شدت سے پہلی بار روئی تھی۔

یہ سب اس کے گناہ ہیں جو ایک، ایک کر کے سامنے آ گئے ہیں۔

اب وہ آواز دے کر بلائے تو کسے؟ فرار ہو کر جائے تو کہاں؟ وہ انتظار کرنے والی آنکھیں تو اب رہی نہیں...... اس کے باپ نے اس کی نافرمانی کی سزا خود ہی اس کے لیے تجویز کر دی تھی۔

''وہ کہیں نہیں جائے گی۔ یہی اس کی سزا ہے۔''

☆☆☆

لیکن آنے والے دنوں میں اسے اندازہ ہوا کہ وہ آزادی کے سنہری خواب سے پیچھا نہیں چھڑا سکتی۔

وہ جب سے یہاں آئی تھی اخبار، کتابیں، کاغذ، قلم جیسی ہر چیز سے دور کر دی گئی تھی۔ اتنے بڑے محل کے اس حصے میں جہاں سے آگے جانے کے راستے پر اس نے ہمیشہ اسلحہ بردار گارڈز کو تعینات پایا۔ ٹی وی، ریڈیو نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ وہ جب بھی کھڑکی کے شیشے کے ادھر لوہے کی موٹی گرل سے سر نکا کر باہر جھانکتی تو دور فاصلے پر کسی مکان سے لکڑیوں کے چولھے پر شام کا کھانا پکنے کی خوشبو اسے زندگی کی گرمائش کا احساس دلاتی تھی۔ اس کا جی چاہتا، وہ... کڑکڑاتے گھی میں لہسن کے بگھار کی حسین مہک والے کچے مکانوں کے اندر جا کر وہاں رہنے والوں کی دنیا کو قریب سے دیکھے...... ان کے دیگچے میں ڈھکن اٹھا کر جھانکے۔ نمک، مرچ کا اندازہ لگائے اور انہیں صاف، صاف بتا دے کہ وہ ان کے گھر کے کھانے کے بارے میں کیا سوچتی ہے۔ آخر وہ ایسی ہی کوئی ریسرچ کرنے یہاں آنا چاہتی تھی ناں......

مگر اس کے باہر نکلنے پر سخت پہرا تھا۔

انہیں کیا ڈر تھا...... پتا نہیں......

وہ انہیں کیا نقصان پہنچا سکتی تھی...... پتا نہیں، وہ محسوس کررہی تھی۔ فاروق کی غیر موجودگی میں اس کے بڑے بھائی کا قیام رہائش گاہ کے اس حصے میں طویل ہونے لگا ہے۔ اس کی اپنی بیوی ان کی خاندانی رہائش گاہ میں رہتی تھی۔

فرقان، فیروز معظم خان کا سب سے بڑا بیٹا جو اپنے دو چھوٹے بھائیوں کی طرح اعلیٰ تعلیم یافتہ تھا مگر جب دل چاہتا، وقت بے وقت اس کا دروازہ بجانے اور دروازہ کھول کر کمرے تک چلا آنے لگا تھا۔ اس کی آنکھوں کی لپک عجیب تھی۔

کون تھی وہ...... سڑک پر پڑا ہوا نوٹ......؟ پتا نہیں کیوں اسے لگتا تھا کہ فاروق یہ برداشت نہیں کر پائے گا۔ فاروق واقعی یہ برداشت نہیں کرسکتا تھا۔

وہ ایک تکلیف سے بھری خوفناک رات تھی۔

فاروق اسے روئی کی طرح دھنک کر شہر کے لیے نکل چکا تھا۔ بجلی غائب تھی اور اس کی کھڑکی کے نیچے علاقے کے سارے کتے ایک ساتھ مل کر بھونک رہے تھے۔ اس خالی محل کے لمبے دالانوں میں دبے قدموں چلنے پھرنے والے ملازم کام سمیٹ کر کب کے اپنے کوارٹرز میں جاچکے تھے۔ وہ اس شخص کے ہاتھوں پٹ کر جہاں کچھ دیر پہلے گری تھی وہاں گھپ اندھیرے کے باوجود وہ جانتی تھی اب خون کا دریا تھا۔ اسے اتنی گہری چوٹ بھی نہیں آئی پھر اتنا خون...... درد کی زبردست لہر کے ساتھ ایک اجنبی خوف اس کی رگوں میں دوڑ رہا تھا۔ کہیں اس کا کوئی بہت بڑا نقصان نہ ہوجائے۔

اس رات سبرینہ گیبرئیل فاروق خان بجلی کی عدم موجودگی میں گھپ اندھیرے میں پڑی، اپنے ہی خون کے تالاب میں ڈوب کر مرگئی ہوتی مگر وہ نہیں مری......

اس نے تکلیف سے دوہری ہوتی کوکھ کو دونوں ہاتھوں سے دبائے گھپ اندھیرے میں زمین پر پڑے، پڑے ہی کمرے کا دروازہ کھلتے اور کسی کو اندر آتے دیکھا تھا...... موم بتی کی روشنی میں نظر آنے والا وہ ایک دوپٹے کا ہیولہ سا تھا جو اسے نظر آیا تھا...... کسی نے کسی کو پکارا تھا۔ کوئی بھاگا تھا کوئی...... اسے یاد رہی تو صرف ایک ناقابلِ بیان درد کی طویل رات...... جو ختم ہونے کا نام نہیں لیتی تھی۔

کسی عورت کی آواز...... جو مقامی زبان میں کہہ رہی تھی۔

''ہائے شوہدی، ایہد ابال تے مرگیا اے۔ اے تے نیلی تھی گئی اے۔'' (ہائے بیچاری...... اس کا بچہ تو مرچکا ہے۔ یہ تو نیلی پڑگئی ہے۔)

طبی سہولتوں سے عاری، ترقی کے کم ترین معیار پر بھی پورا نہ اتر سکنے والے اس علاقے میں جہاں کوئی سند یافتہ ڈسپنسر بھی دستیاب نہیں تھا۔ ولایت پلٹ، ولایت یافتہ چوہدریوں کی بیچاری رعایا، اپنے چھوٹے موٹے دکھ درد کا علاج، نیم حکیموں سے کروانے کی بھی استطاعت نہیں رکھتی تھی۔ سنگ مرمر کی وسیع و عریض رہائش گاہ کے باہر پیٹ کا ایندھن بھرنے کو لوگ اپنے بچے تک فروخت کرنے پر مجبور ہوجاتے تھے۔ اس اونچے محل کی دیواروں میں اس کا چھ مہینے کا مرا ہوا بچہ گاؤں کی ان پڑھ دائی نے لالٹین کی روشنی میں نہ جانے اس پر کتنے پہاڑ توڑ کر اس کی کوکھ سے نکالا تھا۔

اس کی جان تو بچ گئی تھی لیکن دل میں اگنے والی ننھی سی امید کا پودا خاموشی سے مرگیا تھا۔ ہوش ٹھکانے آتے ہی اسے ایک ایسے زبردست نقصان کا احساس ہوا تھا جو شاید اس شادی نام کے کل جوئے کا حاصل جمع، بن سکتا تھا۔

اس نئی روح کے دنیا میں آنے کے فیصلے میں، اس کی رضا شامل نہیں تھی لیکن اس کے آنکھ کھولے بغیر آخری دم دینے کی تکلیف اسے بار، بار اسی کند چھری سے چیرتی رہی، جس نے اندھیری حبس زدہ رات کی ٹمٹماتی، ناکافی روشنی میں اس کے بچے کو ٹکڑے، ٹکڑے کردیا تھا۔

فاروق خبر سن کر بھی کئی دن اس کے پاس آنے کا وقت نہیں نکال سکا تھا۔ یہ پہلا موقع نہیں تھا پھر بھی اس

رات اسے فاروق سے ایک ایسی سیاہ اور ناقابلِ بیان نفرت محسوس ہوئی جو اس کے آس پاس کی ہر چیز کو جلا کر راکھ کر سکتی تھی...... دنیا تہس نہس کر سکتی تھی۔

فاروق کو کوئی افسوس نہیں تھا...... اسے ایک غیر ملکی عورت سے، اپنے خاندان کا وارث چاہیے ہی نہیں تھا۔ اس کے باپ، دادا اور بھائیوں نے اپنی نسل آگے بڑھانے کے لیے خاندانی عورتوں سے شادیاں کی تھی۔ اس کے باپ کا خیال تھا کہ خاندانی عورت ہی ان کے خون کو بیرونی آلائشوں سے پاک رکھ سکتی ہے۔

فاروق آیا تو...... سبرینہ کو لگا وہ کسی بات پر بے اندازہ خوش ہے۔ اسے خوشی کی وجہ جاننے میں دلچسپی نہیں تھی، اسے چند بول ہمدردی کے سننے کی توقع تھی۔ ویسی ہی سچی جیسی وہ اپنی ریس کی گھوڑی کے بیمار پڑ جانے پر سبرینہ کی طرف سے سننے کا خواہش مند رہ چکا تھا اب نہیں بلکہ شروع دنوں میں......

وہ اپنے باپ کے باغات پر اگنے والے، رس دار پھلوں کے حقوق اگلے کچھ سالوں کے لیے ایک بڑی ملٹی نیشنل کمپنی کو ٹھیکے پر دینے کے بے اندازہ بڑے کاروباری سودے کے قانونی نکات طے کرنے امریکا جا رہا تھا۔

فاروق کے وجود سے اٹھتی کلائیو کرسچین کی خوشبو اسے خوفزدہ کر رہی تھی...... وہ توقع کے برخلاف اچھے موڈ میں تھا...... مگر وہ نہیں تھی۔

اس کی جسمانی طاقت پوری طرح بحال نہیں ہوئی تھی۔ عنایت دائی کی چھریوں کے زخم، ابھی پوری طرح بھرے نہیں تھے۔ پھر بھی وہ ہمدردی کے چند جملے سننے کی منتظر ہی رہی...... اسے پتا ہونا چاہیے تھا، آج وہ جس چونچال موڈ میں ہے اسے رات بھر کے ساتھ کے لیے...... اس کے خالی اور زخم، زخم وجود کی حاجت ہو بھی نہیں سکتی۔

وہ کچھ زیادہ ہی جلدی میں تھا۔ وہ کہاں گیا تھا۔ وہ کہاں جاتا تھا...... یہ جاننے کی اسے خواہش نہیں رہی تھی۔ اس کے ہوش ٹھکانے آچکے تھے۔

☆☆☆

فاروق کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ سبرینہ سے تعلق اتنی جلدی پیچیدہ ہو جائے گا...... اس کو یہ بھی نہیں لگتا تھا کہ انہیں شادی ہی کرنی پڑ جائے گی......

جب وہ پاکستان سے سردیوں کی چھٹیاں گزار کر واپس ایڈنبرا آیا تو سبرینہ اپنی بہن اور باپ کو دکھی کرنے والے فیصلے پر سخت احساسِ جرم کا شکار تھی...... اسے لگا اگر اس نے آگے بڑھ کر صورتِ حال کو نہ سنبھالا تو وہ اپنا راستہ بدل لے گی۔

اگلے چھ مہینے اس نے سبرینہ کو پیچھے مڑ کر دیکھنے کا موقع ہی نہیں دیا...... اس نے اپنی گرم جوش محبت کے اندھے طوفان سے اس قابل پروفیسر کی ذہین بیٹی کا اپنے قدموں پر کھڑا رہنا دوبھر کر دیا تھا۔ ان دنوں فاروق اس کا ایسا دیوانہ بنا ہوا تھا کہ اس کی صراحی دار گردن کی باریک خوب صورت کھال کے پار سے گزرتے مشروب کا رنگ تک دیکھ کر اچھل پڑتا تھا......

وہ عیسائی تھی لیکن زیادہ مذہبی قطعاً نہیں...... پھر اس کا مشرقی پس منظر، رومان سے بھرپور، موسیقی سے لبریز محبت کے اس سنہری جام کو کسی باقاعدہ تعلق میں بدلنے پر راضی نہیں ہوتا تھا۔

وہ بے حد عجیب لڑکی تھی۔ اور اسے اپنا بنانے کو فاروق پاگل ہوا جا رہا تھا۔ جب ہر کوشش ناکام ہوگئی تو آخری سمسٹر ختم ہوتے ہی فاروق نے اسے شادی کی پیشکش کر ڈالی۔

کرسمس کے بعد سے اس کی اپنے باپ اور بہن سے ملاقات نہیں ہوئی تھی...... ایما کے آخری فون سے اسے پتا چلا تھا کہ وہ جس رضا کار مشن پر غزہ جا رہی تھی...... وہ ملتوی ہو کر مئی سے شروع ہو رہا تھا۔ ڈیڈی ایک بڑی ایجوکیشن کانفرنس کے لیے کوپن ہیگن جانے والے تھے۔

پھر بھی وہ ایڈنبرا چھوڑنے سے پہلے، ایک بار اپنے باپ اور بہن کو یہ تسلی دینا چاہتی تھی کہ اس نے کوئی

غلط فیصلہ نہیں کیا...... وہ ایک ایسی جگہ جا رہی ہے...... جہاں ترقی یافتہ دنیا کی یونیورسٹیوں میں پڑھایا جانے والا معاشی ترقی اور سماجی بھلائی کا سہانا خواب حقیقت بنایا جاسکتا ہے۔ وہ اپنے باپ کو یقین دلانا چاہتی تھی کہ اس نے ایک صحیح فیصلہ کیا ہے لیکن جب وہ فاروق کو ڈیڈی اور ایما سے ملوانے اپنے گھر پہنچی تو گھر کے بند دروازے کے باہر کئی دنوں کے اخبارات اٹھائے جانے کے منتظر تھے۔ اس نے ایما کے اسپتال فون کیا تو پتا چلا، ایما ڈیوٹی پر نہیں ہے...... اس نے ڈیڈی کا معلوم کرنے کے لیے ان کے کالج سے رابطہ کیا تو پتا چلا کہ وہ کسی کانفرنس میں شرکت کے لیے انگلینڈ سے باہر ہیں۔ ایما نے یقیناً جھوٹ نہیں بولا تھا۔

مگر وہ پچھلے کتنے دنوں سے، اپنے باپ سے بات کرنے کو ترس رہی تھی...... وہ جھوٹ موٹ ہی سہی، ان کے منہ سے سننا چاہتی تھی کہ وہ کوئی غلطی نہیں کر رہی ہے لیکن اپنے گھر کے بند دروازے کو دیکھ کر اس کی آنکھیں بھر آئیں اس لیے نہیں کہ اس کے گھر والے موجود نہیں تھے بلکہ اس لیے کہ فاروق کے سامنے اس کی کتنی بے عزتی ہوئی تھی۔

''ہونہہ...... ایسے تھے اس کے گھر والے...... اسے یہ بھی بتانا ضروری نہیں سمجھا کہ وہ کہاں ہیں۔''

جس دن اس نے فاروق کے ساتھ جہاز کے پروں کے نیچے رہ جانے والے، سرسبز اور حسین ایڈنبرا، اسکاٹ لینڈ کو الوداع کہا اس دن اگست انیس سو اٹھاسی کا آخری سورج ڈوب رہا تھا اور اسے اپنے باپ اور بہن سے ملے کئی مہینے ہو چکے تھے۔

☆☆☆

یکم ستمبر 1988ء

وہ پاکستان اترے تو سیاسی موسم گرم تھا۔ ملک میں نئے عام انتخابات کا موسم شروع ہونے والا تھا۔ فاروق کے خاندان کی سیاسی مصروفیات بے انتہا بڑھی ہوئی تھیں۔ پھر بھی فاروق کے رعب اور دبدبے والے باپ کو شادی پر کوئی اعتراض نہیں ہوا۔ ان کے خاندان میں غیر ملکی عورتوں سے شادیاں ہوتی آئی تھیں۔

شادی ملتان سے کچھ گھنٹے کی مسافت پر واقع ان آبائی زمینوں پر ہوئی جو تین پشت پہلے فاروق کے بزرگوں کو برطانوی راج سے کسی نامعلوم خدمت کے عوض انعام میں ملی تھیں۔

سبرینہ نے ڈیولپمنٹ اکنامکس میں ماسٹرز کے دوران، اس زرخیز اور رنگا رنگ کہانیوں سے بھرے...... پُراسرار جنوبی ایشیا کی جو تصویر اپنے دماغ میں بنائی تھی۔ پاکستان کے سب سے بڑے صوبے کا یہ جنوبی علاقہ بالکل ویسا نہیں تھا۔ تحقیقی کتابیں لکھنے والے آپ کو کبھی یہ نہیں بتاتے کہ جس بے رنگ اور بے بو دنیا کا وہ ذکر کر رہے ہیں، اس میں رہنے والے وجود، کتابوں میں درج بے معنی نمبر نہیں گوشت پوست کے زندہ انسان بھی ہیں۔ جن کی تہذیب، جن کا تمدن، زندگی کی گرمی سے بھرپور خوشحال اور آسودہ چہروں میں دوڑتا ہے۔

اسی ثقافت کی خوش نما اوڑھنی اوڑھے، کانوں میں رس گھولتے، سُریلے قہقہوں، کسی اجنبی زبان میں سنائے گئے گیتوں اور نغموں سے ٹکرانے والی مہنگی اور پُراسرار خوشبوؤں کا میلا سجائے بیٹھی وہ سنڈریلا اپنے پرنس کا انتظار کر رہی تھی۔ جس کی نہ بہن سوتیلی تھی نہ باپ......

شادی اس کی توقع سے کہیں زیادہ اختصار سے ہوئی پھر بھی اسے لگا وہ کوئی خواب دیکھ رہی ہے۔ خواب، جو تب تک خواب رہتا ہے جب تک آنکھ کھل نہ جائے اور اس کا اثر تب تک زائل نہیں ہوتا جب تک انسان حقیقت سے آنکھیں چار کرنے پر راضی نہ ہو جائے۔

شادی کے ریسپشن پر اس کی ملاقات پہلی بار فاروق کے گھرانے کی عورتوں سے ہوئی۔ اس کی ماں، اس کی دادی، اس کے بھائی اور کزنز کی بیویاں...... نوجوان لڑکیاں...... جن میں سے کئی کالج، یونیورسٹی کی تعلیم حاصل کر رہی تھیں۔ کوئی لاہور میں، کوئی ملتان میں، کوئی کہیں اور...... بہترین لہجے میں انگلش بولتی، وہ کہیں سے بھی کسی کم تعلیم یافتہ ملک کی

پیداوار نہیں لگتی تھیں۔

فاروق اسے مسکراتا دیکھ کر اس کے پاس آیا۔

”میں نے تمہیں بتایا تھا ناں ہمارے خاندان میں لڑکیوں کی تعلیم پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ لڑکیاں ہر فیلڈ میں آگے ہیں۔ تم دیکھنا، اگلے کچھ عرصے میں ہماری اپنی اسٹیفی گراف اور مارٹینا نیورا ٹی لووا ہوں گی۔“ یہ وہ سال تھا جب ٹینس کی دنیا میں گراف اور نیورا ٹی لووا کے جادوئی گیم پر سائنسی تحقیق ہو رہی تھی اور وہ تیسری دنیا کا ذہین، ترقی پسند اسے یقین دلا رہا تھا کہ اس کا خاندان تعلیم اور ترقی کا کس قدر دلدادہ ہے۔ وہ مسکراتا تھا اور جان لے لیتا تھا۔ اس نے کتنی بار اپنا دل، اپنی آنکھوں میں دھڑکتا پا کر خود کو ڈپٹنے کی کوشش کی تھی۔ کیا وہ سولہ سال کی لڑکی کی طرح بی ہیو کر رہی ہے۔ کتنی بار اس روز وہ اپنے محبوب کی طبیعت کی جولانی پر نثار ہوئی تھی اسے یاد نہیں۔

”پلیز ایسے آنکھیں پھاڑ کے مت دیکھو بھابی سبرینہ..... سب جانتے ہیں تم باہر سے آئی ہو مگر یہاں ہماری کوئی عزت ہے، خدا کے لیے کچھ لحاظ کرو..... وہ رات کو تمہارے پاس ہی آئے گا۔“

یہ پاس کھڑی فاروق کی سجی بنی، خوشبودار اور تیز طرار کزن تھی۔ آئی شیڈ اور مسکارے سے بوجھل نقلی پلکوں کے پیچھے چمکتی ہوئی کاٹ دار مسکراہٹ اور رائل بلیو شیفون کی باریک تہ سے جھانکتے اس کے سپید، دودھیا بازو..... سبرینہ کی نظر پلٹی تو اپنے سرخ نیل پالش میں رنگے، حسین ناخنوں والی انگلیوں کی انگوٹھیوں میں الجھ گئی۔ جو اس کے ہاتھ کی بیرونی طرف سجائی گئی مہندی کے پیچیدہ ڈیزائن کا رستہ کاٹ رہی تھیں۔

اسے سمجھ میں نہیں آیا کہ اس سے کیا غیر مناسب حرکت سرزد ہوئی ہے..... کیا ابھی، ابھی اس نے اسی حق کے بدلے اپنی زندگی گروی نہیں رکھی۔

شادی کا ہنگامہ ٹھنڈا ہوا تو فاروق اسے لے کر گھومنے نکل پڑا۔

اسے بھوربن کا قیام، اسی خواب کا حصہ لگا جسے مسلسل دیکھنے کے بعد اس کی آنکھیں جیسے عادی نہیں ہو پا رہی تھیں۔

ملائم، چمکدار، پھسلتے فرش والے بڑے بڑے ہال..... دیواروں پر بھی قیمتی پینٹنگز..... زمین سے چھت تک آئینوں سے آراستہ دیواریں..... مہنگے دبیز قالین..... چھت سے لٹکتے بلوریں فانوس..... اور تخت طاؤس جیسے شاہانہ صوفوں پر دھنستے، ابھرتے، فرانسیسی سوٹوں اور کلف لگی شلوار قمیص پر قیمتی واسکٹس میں ہوانا کے سگار پیتے معزز دکھائی دینے والے رئیس..... وہ اس ملک کی کون سی کلاس سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ معلوم کرنے کے لیے اسے کسی تحقیق کی ضرورت نہیں تھی۔ ان کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ انہیں دیکھ کر لگتا نہیں تھا کہ ان کا تعلق اس ملک کے کسی ایسے طبقے سے ہے جو اقلیت میں ہوگا۔

تو پھر وہ پاکستان کون سا ہے جہاں دنیا کی مجموعی آبادی کے چار فیصد انسان غربت کی کم سے کم حد ایک ڈالر یومیہ سے کم پر زندہ رہتے ہیں۔ اناج کے ہر دانے سے لپٹے کئی بھوکے غربت کی بدنما لکیر تلے پیدا ہو کر اسکول جانے کی عمر کو پہنچنے سے پہلے ہی دم توڑ دیتے ہیں۔ جہاں دو تہائی بچے کبھی پرائمری اسکول کی شکل نہیں دیکھتے۔ انسانی ترقی کے اعشاریوں، ہیومن ڈیولپمنٹ انڈیکس میں جس ملک کا نمبر ایک سو اٹھتر میں ایک سو چھتیسواں ہو وہ ملک جو پندرہ سے بیس لاکھ پناہ گزینوں کی میزبانی کا بوجھ اٹھائے اسلحے کے انبار جمع کیے بیٹھا ہے۔ جس کی ترقی اور معیشت کے پہیے کسی اور کے کاروباری ٹینڈر کھولنے اور بند کرنے کے محتاج چلے آ رہے ہیں۔ وہ ملک جس کی عوامی سیاست خلط ملط ہو چکی ہے۔ وہی عوامی سیاست جسے اس نے بہت قیمتی فیبرک کی شلوار قمیص پر واسکٹ پہنے، ہوٹل کی لابی، ڈائننگ ہالز اور باربی کیو کی ہوشربا خوشبو کے دوران اِدھر سے اُدھر چہل قدمی کرتے، پچھلے دو دنوں میں خوب اچھی طرح دیکھا تھا۔

”تو پھر حقیقت کو کتابوں میں زیادہ ہی خوفناک

بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔'' اس نے فاروق کی بات کو غور سے سنتے، اس کی آنکھوں کی والہانہ چمک سے مسحور ہوتے اپنے اردگرد کی فضا میں موجود حد سے بڑھی ہوئی خوشگوار توانائی کو طمانیت بھری سانس کے ساتھ خود میں... بھر کر بے اختیار ہی مسکراتے ہوئے سوچا تھا۔

سبرینہ گیبریئل پریوں کی کہانیاں سن کر بڑی نہیں ہوئی تھی۔ پھر بھی اس نے خود کو پہلی بار اقتصادیات کی کتابوں کے خشک اعداد و شمار... سے آزاد کر کے سچ مچ کے رنگین خواب دیکھنے کی اجازت دی تھی۔

خوشگوار ہلکورے لیتی سچ شام کی رعنائی چرانے وہ اب ہوٹل کی بالکونی میں آ بیٹھے تھے۔ ڈوبتے سورج کی جادو بھری حلاوت کا مزہ دیتی کافی کے دوسرے ہی گھونٹ پر فاروق کو یاد آیا تھا کہ اس کا ابھی اسی وقت ہوٹل کی لابی میں ایک اہم شخصیت سے ملنا کتنا ضروری ہے۔ اہم شخصیت جس کو اس نے آج دوپہر کے بوفے لنچ کے دوران میں دریافت کیا تھا اور جو اس کے خاندان کا کوئی اہم بزنس کانٹیکٹ ہونے کے ساتھ اسلام آباد کا ایک اہم بیوروکریٹ بھی تھا، جسے آج ابھی اپنی کچھ ضروری میٹنگز نمٹا کر واپس اسلام آباد کے لیے نکلنا تھا۔

فاروق منٹوں میں واپس آنے کا کہہ کر عجلت میں اٹھ کر گیا تھا مگر اس کی ادھوری کافی کی پیالی پر اب انتظار کی تہ گاڑھی ہو چکی تھی۔

☆☆☆

اندر اگر رنگوں کا سیلاب تھا تو باہر قدرت کا بیش قیمت حسن ستمبر کی خوشگوار ہوا سے اپنے ہونے کا خراج وصول کر رہا تھا۔ جسے کافی کا دوسرا پیالہ ہاتھوں میں بھرے، بھوربن کے پانچ ستارہ ہوٹل کی بالکونی میں اکیلی بیٹھی وہ اپنے اندر اتارنے کی کوشش میں ذرا بھی اکتاہٹ محسوس نہیں کر رہی تھی۔ وہ جس دنیا سے آئی تھی، وہاں ستمبر کی ان تاریخوں تک موسمِ خزاں کی خنک ہوائیں چلنا شروع ہو جاتی تھیں۔

یقیناً ہوٹل بنانے کے لیے جگہ کا انتخاب بہت سوچ سمجھ کر کیا گیا تھا۔ پہاڑوں پر دور تک بچھا سبزہ جاتی شام کی کمزور پڑتی دھوپ کے ساتھ، کسی بھی انسان کو یہاں گھر بنانے کے خواب دیکھنے پر آمادہ کرسکتا تھا مگر لمحوں کی گدگدانے والی شاعری کو ایک اجنبی آواز نے درہم برہم کر دیا۔

''اگر آپ برا نہ مانیں تو میں یہاں بیٹھ سکتا ہوں۔''

سلک کے کرتے پاجامے میں ملبوس، کندھے پر شاہانہ انداز سے تہہ کی ہوئی شال ڈالے، ویسی ہی جیسی اس نے لندن میں کچھ انڈین دوستوں کے گھروں میں فرشی نشست والی محفلِ موسیقی میں لوگوں کو پہنے ہوئے دیکھی تھی۔

درمیانے قد کا وہ شخص جس کے سر کے بال آدھے سے زیادہ اڑ چکے تھے۔ ایک زبردست مسکراہٹ سے لبریز چہرہ لیے اس کی اجازت کا انتظار کیے بغیر اس کرسی پر بس بیٹھ ہی چکا تھا جو کچھ دیر پہلے فاروق نے خالی کی تھی۔ ایسے اہتمام سے کندھے پر شال لٹکائے اس نے پاکستان آنے کے بعد اب تک صرف ایک ہی شخص کو دیکھا تھا اپنے آپ کو فخر سے کسان کہہ کر متعارف کروانے والے فاروق کے باپ، اپنے فادر ان لا کو جن کے بارے میں فاروق نے ایڈنبرا میں اسے بتایا تھا کہ انہیں اپنی زمینوں سے زیادہ سیاست اور اپنے وراثتی شوق پورے کرنے میں دلچسپی ہے۔

''شاید یہ شال یہاں سماجی مرتبے کی نشانی ہوتی ہے یا پھر سیاستدانوں کا یونیفارم......'' سبرینہ نے پیشانی پر شکن لائے بغیر حسین شام اور خوشبودار کافی کا آسودہ رومان ملیامیٹ کرنے والے شخص کا سر سے پاؤں تک جائزہ لیا۔

''اوہ، کتنی خوب صورت مسکراہٹ ہے آپ کی...... میں وہاں لابی سے آپ کو دیکھ رہا تھا۔'' وہ اس کے سامنے کرسی سنبھال کر ٹانگ پر ٹانگ رکھ چکا تھا۔ اس کی انگلیوں میں دبے سگار کی یہ قسم ابھی، ابھی سبرینہ نے اندر لابی کے سگریٹ نوشوں کے لیے مخصوص حصے

میں کئی اہم نظر آنے والے ہاتھوں میں دیکھی تھی۔ جو شاید لیے بھی ہوتے ہوں گے۔

"مجھے کہنے دیجیے کہ میں نے اتنی خوب صورت مسکراہٹ پہلے کبھی نہیں دیکھی۔"

اس کی انگلش ہر قسم کے ایکسینٹ سے پاک تھی۔ سبرینہ کو حیرت نہیں ہوئی۔ اس کے وجود سے کسی بے حد مہنگے پرفیوم کی تیز خوشبو اٹھ رہی تھی۔ وہ کچھ دیر ہاتھ میں کافی کا کپ تھامے اس عجیب سے شخص کو دیکھتی رہی پھر اسے ہنسی آگئی۔

"تھینکس......" اس نے اپنی بے ساختہ ہنسی کو خوش اخلاق مسکراہٹ میں چھپانے کی کوشش کی مگر اسے تعریف سے زیادہ اس کے انداز پر ہنسی آرہی تھی۔

"کیا میں آج رات کی بال میں آپ کے ساتھ ڈانس کرسکوں گا۔" اسے اور ہنسی آگئی...... وہ کوئی پاگل تھا اور پتا نہیں اسے کیا سمجھ رہا تھا۔

"آپ کی صورت سے لگتا ہے، آپ کو میری بات پر یقین نہیں آیا۔"

اس نے دیکھا، اس عجیب سے گول مٹول چہرے کی زبردست مسکراہٹ ایک دم چمرا گئی تھی۔ اس کے بال اڑے کشادہ ماتھے پر اب ناگواری کی شکنیں تھیں جیسے اسے اپنا مذاق سمجھا جانا، مذاق میں بھی پسند نہیں آیا۔

"کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ ہنس کیوں رہی ہو؟" سبرینہ کو اس کے جلتی سگریٹ کی طرح بجھ جانے والے موڈ پر ترس آگیا۔

"معاف کیجیے میں یہاں اپنے شوہر کے ساتھ ہوں۔" اس نے مصنوعی لحاظ داری کی کوئی کوشش بھی ضروری نہیں سمجھی۔ "میں صرف اپنے شوہر کے ساتھ ہی ڈانس کروں گی۔ آج رات یا کسی بھی رات کی...... کسی بھی بال میں۔" اپنے جملے کے آخری حصے کو جما، جما کر مسکراتے ہوئے کہہ کر وہ فصیح الدین مانڈوی والا کے چمراتے ہوئے موڈ پر مزید غور کیے بغیر ایک حتمی سا ایکسکیوزمی کہنے کے بعد اپنی چیزیں اٹھا کر اپنا مذکورہ شوہر تلاش کرنے اٹھ کر جا چکی تھی۔ یہ کوئی بڑا واقعہ نہیں تھا۔ واقعی...... سبرینہ گیبریئل جہاں سے آئی تھی وہاں یہ کوئی بڑا واقعہ نہیں ہوگا لیکن فصیح الدین مانڈوی والا اس پانچ ستارہ ہوٹل میں اپنی تمام بزنس اینٹی ٹیز کے چیف ایگزیکٹوز کو لے کر اس مہنگے آر اینڈ آر...... ریسٹ اینڈ ریکری ایشن ٹرپ پر صرف ضروری بزنس میٹنگ کرنے نہیں آیا تھا...... کچھ اچھا وقت گزارنے بھی آیا تھا۔ اسے یہ معلوم کرنے میں صرف پانچ منٹ لگے کہ وہ جو بھاری برٹش لہجے میں، ابھی ابھی اسے اس کی اوقات یاد دلا کر گئی تھی۔ وہ دراصل کس کی بیوی ہے اور ہوٹل کے کس فلور کے کس کمرا نمبر میں ٹھہری ہوئی ہے۔

فاروق نے سبرینہ کو لابی میں آتے دیکھا۔ وہ جس سے بھی ملاقات کر کے آیا تھا۔ اس ملاقات نے اس کے مزاج پر خوشگوار اثر چھوڑا تھا۔ یہ ایک خوش قسمت دن تھا۔ دور سے آتی آسمانی شفون کے نفیس سے ڈریس اور چوڑی دار پاجامے میں، وہ ایسی آفاقی اپسرا لگ رہی تھی کہ فاروق کو اپنی خوش قسمتی پر نئے سرے سے رشک آنے لگا۔

سبرینہ کو اس کا بیوروکریٹ دوست تو کہیں نظر نہیں آیا لیکن وہ خود جیسے کسی خوشگوار احساس کے تحت خوامخواہ ہی مسکراتا اس کے دل میں اترا جا رہا تھا۔ اتنے بہت سے لوگوں کے درمیان بھی اسے لگا اسے دیکھتے ہی اس کی آنکھوں میں روشنی بھر گئی ہے۔ وہ ان آنکھوں میں جگمگاتی ہر تحریر پڑھ سکتی تھی۔ اتنے لوگوں کی موجودگی میں بھی وہ اس سے ایک ایسا برتی، ایسا زبردست تعلق محسوس کر رہی تھی جسے کسی لفظ، کسی لمس کی حاجت نہیں تھی۔ کاش وہ اپنے باپ کو دکھا سکتی کہ اس نے کیسا شاندار شخص اپنے لیے منتخب کیا ہے۔

"اوہ ڈیڈی کاش آپ مجھے خوش دیکھ سکتے، کاش آپ بھی یہاں ہوتے۔"

☆☆☆

فصیح مانڈوی والا زیادہ دیر بالکونی میں نہیں بیٹھ

سکا۔ اسے اندر جانا تھا۔ وہ مضحکہ اڑاتی اپسرا اسے چیلنج کر کے کہیں جا نہیں سکتی تھی۔ ہوٹل کے کشادہ دبیز قالینوں والے آراستہ ہال میں ہونے والی شام موسیقی مہمانوں سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ فرشی نشست پر خوشبوؤں سے مہکتے نازک وجود اپنے، اپنے عزیز رشتوں کے ساتھ معروف گلوکاروں کے دل پسند گیتوں سے لطف اندوز ہوتے مست ہوئے جا رہے تھے۔

ایک مناسب ٹپ ہوٹل استقبالیہ کے رکن کے ہاتھ پر رکھ کر اسے فاروق فیروز خان اور اس کی ہوشربا بیوی کے برابر نشست حاصل کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ گانے والے کی آواز میں آواز ملا کر لہکتے، مسکراتے، بگڑے رئیسوں کی طرح، اپنے سر پر وار کر، گانے والی پر نوٹ نچھاور کرتے اس شخص کے انداز میں کچھ ایسا ضرور تھا کہ فاروق فیروز نے اپنی بیوی سے دھیان ہٹا کر اس سے جان پہچان بڑھانے والی گفتگو شروع کرنے میں دیر نہیں لگائی۔

سبرینہ گیت کے بول سمجھنے سے قاصر تھی مگر جادو بھرے گیت کی دل کو چھو لینے والی دھن میں کچھ ایسا ضرور تھا کہ جس نے اسے دم بخود کر دیا تھا۔ وہ اپنے محبوب کے پہلو میں کسی دوسرے کی محبت کا گیت خوب اچھی طرح سمجھ سکتی تھی۔

اس نے بالکونی میں ملنے والے مسخرے کو بے تکے انداز سے گانے والے پر کرنسی نوٹ نچھاور کرتے ہوئے دیکھا اور یہ بھی کہ اس کا محبوب شوہر اس مسخرے سے گفتگو کر رہا تھا۔ شاید ان کے درمیان فون نمبرز کا تبادلہ بھی ہوا تھا۔

اگلا پورا دن وہ کمرے سے باہر نہیں نکلے۔ سرور سے بھری شام کو پہلا جھٹکا تب لگا جب اسے پتا چلا اس کے شوہر نے اسی مسخرے کو اپنے کمرے میں شام کی چائے پینے کی دعوت دے رکھی ہے۔ سبرینہ اس ہنی مون ٹرپ کو بزنس میٹنگ بنانے پر الجھ گئی تھی...... لیکن فاروق کا خیال تھا کہ اس میں کوئی حرج نہیں...... وہ ایک طویل اور ناخوشگوار شام تھی۔ نئے، نئے لوگوں سے ملنے کی شوقین ہونے کے باوجود وہ ٹھیک سے نہیں جان پائی کہ اسے اس مسخرے میں کیا برا لگ رہا ہے۔ جس کی چھوٹی، چھوٹی آنکھوں میں عجیب سی چمک اسے دیکھتے ہی مزید تیز ہو گئی تھی۔ سبرینہ سر سے پاؤں تک بہترین پاکستانی لباس میں تھی مگر اسے لگا مسخرے کی آنکھیں کم لباسی کا احساس دلا رہی ہیں۔ وہ دونوں باہمی دلچسپی کی بات کر رہے تھے۔ زمینوں کی، اسٹاکس کی، کاروبار... کی، ملکی حالات کی...... اور کچھ تھا جو ٹھیک نہیں تھا۔ پھر فاروق کو ہوٹل کے استقبالیہ سے آنے والی ایک ضروری فون کال نے مہمان سے معذرت کر کے نیچے لابی میں کسی ایمرجنسی ملاقات کے لیے کمرے سے باہر جانے پر مجبور کر دیا۔

مسخرہ تنہائی ملتے ہی بھرپور مسکراہٹ اور انتہائی خوش مزاجی کے ساتھ ذاتی سوال پوچھنے لگا۔

سبرینہ کو بے حد عجیب احساس ہوا۔ فاروق نے واپس آنے میں بہت دیر لگا دی تھی۔ روم سروس کا خوب اکڑی ہوئی کلف لگی وردی والا مؤدب ویٹر پُرتکلف چائے کی ٹرالی لا چکا تھا۔ جسے مہمان کو پیش کرنے کی روایت سے آگاہ ہونے کے باوجود اس نے اپنی جگہ سے حرکت کیے بغیر مسخرے کو ”چائے لیجیے“ کا مشورہ دیا تھا۔

وہ بار، بار اپنی کلائی کی گھڑی پر نظر ڈال رہی تھی۔ اس کے انتہائی ذاتی اور بے تکے سوالوں کے جواب میں کوئی سخت بات کہنے سے خود کو باز رکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ آخر وہ اسے کیوں بتاتی کہ اس کا فاروق سے عشق کتنے عرصے میں شادی تک پہنچا تھا۔ حتیٰ کہ جس وقت مسخرے نے اس کے منہ سے روکتے، روکتے بھی پھسل جانے والے ٹکا توڑ جواب پر بے وجہ ہی اونچا سا قہقہہ لگاتے اپنی جگہ سے اٹھنے کی کوشش کی تھی...... فاروق نے واپس کمرے میں قدم رکھا تھا۔ مسخرہ اٹھتے، اٹھتے بدمزہ ہوا تھا۔ سبرینہ کی جان میں جان آئی تھی۔

(باقی آئندہ)

شاید وہ محض اتفاق ہی تھا۔ اگلا تمام دن فاروق اسے لے کر ہوٹل کے قریب پہاڑوں میں ہائیکنگ ٹریکس دریافت کرتا رہا۔ وہ ایک اسپورٹس مین تھا۔ گھڑ سواری، تیراکی اور کرکٹ اس کے ڈی این اے میں شامل تھے۔ چیفس کالج کے دنوں میں اس کے شوق کالج کے لیے ٹرافیاں جیتنے کا سبب بنتے رہے تھے۔

ہوٹل کا سوئمنگ پول دن کا بیشتر حصہ آباد رہتا تھا۔ غیر ملکی مہمانوں کے ساتھ فاروق بھی تیراکی کے

ناولٹ

ادھورے کھوئے لمحے

تابندہ نعیم

پاکستان کی انتہائی معتبر، انتہائی خوب صورت اور انتہائی گہرے جملے لکھنے والی مصنفہ رفعت ناہید سجاد کے انداز تحریر سے متاثر ہو کر شروع کی جانے والی یہ کہانی گزشتہ کئی سالوں سے ٹکڑوں کی شکل میں لکھی جاتی رہی۔ اس عرصے میں پاکستانی معاشرہ تبدیل ہوچکا ہے۔ اب پاکستان کے پبلک پارکس میں شاید ہی کوئی غیر ملکی خاتون پاکستانی طالبات کو شام کی تفریح کرانے نکلتی ہو... مگر ہمارے آپ کے اسی پاکستان میں کبھی ایسا ہوا کرتا تھا۔ کہانی فرضی ہے۔ اس کے واقعات ـن انیس سو ستاسی سے انیس سو بچانوے تک کے حالات اور کرداروں پر مبنی ہیں، تاہم ان کی کسی حقیقی کردار یا واقعے سے مماثلت محض اتفاقیہ ہو سکتی ہے۔

چوتھا حصہ

کسی موقع کو ضائع نہیں کرتا تھا۔ شام کو سوئمنگ پول کے گرد باربی کیو کے شوقین افراد تندہی سے چکن کی مہک کے ساتھ اپنی، اپنی مرضی کا مشروب لیے شکم اور نگاہ کے سرور کا بندوبست کررہے تھے۔

وہ سارے دن کی تھکا دینے والی سرگرمی کی وجہ سے اتنی تھک چکی تھی کہ کمرے میں تازہ دم ہونے کے بعد سوئمنگ پول کے گرد پڑی ایزی چیئر پر سستی سے بیٹھی تھی۔ اور پانی میں چھلانگ لگاتے، ڈوبتے ابھرتے تیرتے، سنہری سیاہ گندمی انسانوں کو حسین شام کے رنگوں سے اپنا حصہ وصول کرتے دیکھ رہی تھی۔

اس کے محبوب نے ایک زوردار چھپاکے سے پانی میں کودنے کے بعد ایک لمبا چکر مکمل کر کے کنارے پر ابھرتے ''ہیے...... سبرینہ'' کا نعرہ لگایا تھا۔ وہ کنارے پر قطار سے لگی لمبی کھڑی کینو پیوں کے نیچے سفید جالی دار میزوں کے گرد بچھی کرسیوں پر بیٹھی، کئی حسین لڑکیوں کی رشک بھری نظروں کی زد میں تھا...... اور خوب جانتا تھا۔

شاید وہ بھی اپنی خوش قسمتی پر۔ ابھی کچھ دیر اور رشک کرتی اگر اسے اپنے قریب جھکے کسی ناخوشگوار وجود کی موجودگی کا احساس نہیں ہوا ہوتا۔

''حیران ہوں، کسی ایسے شخص کا محبوب ہونا کیسا لگتا ہوگا، جس کی طلب سب کو ہو۔'' فصیح ماڈوی والا اس کی طرف جھکا نہ جانے کس سے جل رہا تھا اور کسے جلانے کی کوشش کررہا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں سرخ مشروب کا گلاس تھا۔ اس کی چھوٹی، چھوٹی آنکھوں میں تیرتی سرخی بتا رہی تھی کہ یہ ایسا پہلا گلاس نہیں ہے۔ اس کی سانس سے اٹھتی الکحل کی بدبو سے سبرینہ کا دماغ جھلس گیا۔ وہ آج ایسی کسی سوشلائزنگ کے موڈ میں نہیں تھی۔ فاروق سوئمنگ سے واپس آتا تو وہ کھانا کھا کر صرف سونا چاہتی تھی۔

''ایک دم زبردست......'' سبرینہ نے ایک مصنوعی مسکراہٹ طاری کر کے اس بدبودار آدمی کا وار کم کیا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ اتنی تھکی ہوئی تھی کہ کسی بے معنی جملے بازی میں الجھنا نہیں چاہتی تھی۔

''سوچتا ہوں مجھے کب ایسی عزت ملے گی؟'' وہ اس کے کرسی چھوڑتے ہی اس کے پیچھے لپکا تھا۔ اور اب اس کا راستہ روکے فلرٹ کرنے کی کوشش کررہا تھا۔

اس نے پلٹ کر ذرا کی ذرا سوئمنگ پول پر نظر ڈالی، جہاں ابھی ابھی اس کے یونانی دیوتا جیسے شوہر نے اسے رجھانے کے لیے زمین آسمان ایک کیا تھا۔ اور اب اپنی بیوی کو پرچانے کا ارادہ ترک کر کے ایک سنہری جل پری کو تیراکی کا وہ ناممکن انداز سکھا رہا تھا۔ جس کا مظاہرہ ابھی ابھی اس نے ''ہیے سبرینہ'' کا نعرہ لگا کر کیا تھا۔ وہ اتنا مگن تھا کہ اس نے اپنی بیوی کو کنارے پر کسی غیر دلچسپ وجود سے الجھتے دیکھنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی تھی۔

''اس کا انحصار اس بات پر ہے کہ آپ اپنی ترجیحات کتنی جلدی درست کرتے ہیں، مسٹر ماڈوی والا۔'' اپنی طرف سے اس کی طبیعت صاف کر کے وہ آگے بڑھی تھی۔ اسی وقت ہوٹل کے باربی کیو ایریا میں بجنے والی مدھر موسیقی ایک زوردار بینگ کے ساتھ دیوانی ہوئی۔ ہوٹل آرکسٹر نے کسی پرجوش دل کی فرمائش پوری کی تھی۔ ڈرم کی بیٹ تیز ہوتے ہی سوئمنگ پول سے ذرا فاصلے پر دھری کرسیوں پر بیٹھے ملکی اور غیر ملکی تالیاں بجاتے، جھومتے کرسیوں سے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ دیوانہ وار رقص کا دور اب شروع ہوا ہی چاہتا تھا۔

''مجھے یقین ہے، میں نے اپنی ترجیح درست طے کی ہے۔'' اس کے بازو میں دھنسی مسخرے کی موٹی انگلیوں کی گرفت مضبوط تھی۔ اس کی چھوٹی، چھوٹی غلیظ آنکھوں کے عزائم کسی اندھے کی نظر سے بھی پوشیدہ نہیں رہ سکتے تھے۔ سبرینہ نے اپنے دوسرے ہاتھ سے اس کی آہنی گرفت سے اپنے آپ کو آزاد کرانا چاہا۔ مزاحمت کی زبردست کوشش میں اپنے ارد گرد نظر دوڑائی، فاروق کہیں نہیں تھا۔ اس کے گرد لوگ دیوانہ وار ناچ رہے تھے۔ ایسے میں پبلک نے دیکھا بھی ہوتو

ایک غیر ملکی دکھائی دینے والی لڑکی کو ایسی دیوانگی اور استحقاق بھری گرفت سے آزاد کراتے دیکھ کر جوڑے کا اندرونی معاملہ سمجھنا اور بے خود کرنے والی موسیقی میں خود کو گم کر دینا مشکل نہیں تھا۔

وہ بازو چھڑانے کی کوشش میں کامیاب تو کیا ہوتی، تیز میوزک کی لے پر اسے اپنے ساتھ دبوچے مسخرا، اس کے پورے وجود سے کسی بدبودار، لجلجے سانپ کی طرح لپٹا، سر سے پاؤں تک اسے غصے اور نفرت کی ایک ناقابلِ بیان سیاہ آگ کے شعلے میں دھکیل رہا تھا۔

بعد میں اسے یاد نہیں آیا کہ وہ پورے حلق سے ایک بار چلائی تھی یا کئی بار..... مگر اس کا محافظ اس کا محبوب نہ جانے کہاں تھا۔

ہاں، جب اس نے مانڈوی والا کے سنہری راسلک کے کرتے والے بازو کو پوری طاقت سے دانتوں میں چبا کر چھوڑنے کا ارادہ بالکل ہی ترک کر دیا تو مانڈوی والا کی چیخیں اتنی بلند ضرور تھیں کہ ناچتے وجود ٹھٹک کر رکنے پر مجبور ہو گئے۔

”کیا ہوا؟ کیا ہوا؟“ کہہ کر اُن کی طرف لپکتے چہروں میں اس نے دیکھا، ایک چہرہ فاروق کا بھی تھا۔

فاروق کے گیلے وجود سے ٹپکتے پانی کے قطرے، سفید سوئمنگ ٹاول گاؤن میں جذب ہو رہے تھے اور وہ اسے مانڈوی والا سے الگ کر کے اب اپنی بیوی کی... بدتمیزی کی معذرت کر رہا تھا۔

اس کا زلزلوں کی زد میں آیا صدمے کی زیادتی سے کانپتا وجود، ایک ہیجان کی کیفیت میں تھا۔ وہ جس میں اس کی ”جان“ تھی وہ اس سے ایک لفظ دل جوئی کا کہے بغیر اس مکار مسخرے کی دل جوئی میں مصروف تھا۔

وہ صدمے سے گنگ ہو گئی تھی۔

”کیا ہوا سبرینہ.....؟ تم اتنی پریشان ہو گئیں؟ وہ تمہارے ساتھ صرف ایک ڈانس ہی تو کرنا چاہتا تھا۔“ بعد میں فاروق نے اس کے گرد بازو پھیلا کر اسے بچے کی طرح پچکار کر کہا تھا۔

”صرف ایک ڈانس.....“ کیا فاروق اتنا سادہ ہے..... کیا وہ اتنا بھی نہیں جانتی کہ ایک بے ضرر ڈانس اور چوراہے میں کسی دوسرے کی بیوی سے دست درازی کرنے میں کیا فرق ہوتا ہے؟ وہ جہاں سے آئی تھی وہاں ایک بے ضرر اور پریشان کن لمس میں فرق کرنا، پانچویں اور چھٹی کلاس کے بچوں کو سکھایا جاتا ہے۔

”واقعی..... وہ اتنی پریشان کیوں ہو گئی تھی؟“ مانڈوی والا ایسی بے عزتی کے بعد بھناتا، ہوا نکلے غبارے کی طرح کھسیانی ہنسی ہنستا، مہذب دنیا کا فرد ہونے کا دعویٰ کرتا، فاروق کی معذرت قبول کرنے کی ایکٹنگ کرتا، فوراً بے مزہ ہوتی محفل سے جا چکا تھا۔

فاروق بھی وقت ضائع کیے بغیر اسے ہوٹل کے اسی کمرے میں ہنکا لایا تھا جہاں پچھلے چند دنوں میں سبرینہ نے اپنی زندگی کا سب سے خوب صورت وقت گزارا تھا۔ لیکن جہاں آج اپنے شوہر کے ساتھ داخل ہوتے اس کے دل میں ایک نہیں کئی خدشے سر اٹھا رہے تھے۔

یہ کیسے ممکن ہے کہ فاروق اس کی بات پر یقین ہی نہ کرے..... فاروق نے کمرے میں آنے کے بعد روم سروس سے کھانا آرڈر کیا اور کھایا بھی، اس سے شامل ہونے کے لیے وہ اصرار بھی کرتا رہا مگر سبرینہ کے حواس ابھی صورتِ حال کو تسلیم ہی نہیں کر پا رہے تھے۔

اسے زبردست تذلیل کا احساس ہو رہا تھا۔

اس کے محبوب شوہر نے سونے سے پہلے بالکل چت لیٹ کر چھت تکتی اپنی خاموش محبوبہ کی ایک مہکتی لٹ ہولے سے کھینچی تھی اور جھک کر کہا تھا۔

”میرے خیال سے تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے..... کیا تمہیں واقعی لگتا ہے کہ اس کا ارادہ تم پر حملہ کرنے کا تھا۔“

”ارادے کی تعریف تمہارے نزدیک کیا ہے؟ گھٹیا انسان۔“ سبرینہ نے دانت پر دانت جما کر غصے کی جھلسا دینے والی لہر کو دبا کر اس کی آنکھوں میں غور سے جھانکا۔

”دیکھو سبرینہ، میرے خیال میں وقت آ گیا ہے کہ تم جان لو، دنیا کے جس حصے میں ہم رہتے ہیں

وہاں بیوی اپنے شوہر سے اس طرح بات نہیں کر سکتی جیسے تم مجھ سے کرتی ہو...... یہ نا قابلِ قبول ہے۔'' وہ برا مان کر اس کے پاس سے ہٹ گیا اور منہ موڑ کر ناراضی سے بولا سبرینہ اٹھ بیٹھی۔ اس پر غصے کی زیادتی سے لرزہ طاری تھا۔

''اب یہ مت کہنا کہ دنیا کے جس حصے میں تم رہتے ہو وہاں کوئی بیمار ذہن شخص تمہاری بیوی پر مجرمانہ حملہ کر سکتا ہے اور یہ قابلِ قبول ہے؟'' اسے پتا نہیں تھا کہ اس کی آنکھ سے گیلا، گیلا جو بہہ نکلا تھا وہ اس کے آنسو تھے۔

لیکن فاروق کی آنکھوں میں جو اچانک ہی لہریں لینے لگا تھا وہ غصہ تھا جو سبرینہ کے لیے بالکل ہی نیا تھا۔

''اوہ بس کرو سبرینہ...... میں آج کی رات کوئی بحث نہیں چاہتا، میں سخت تھکا ہوا ہوں۔ چلو اب اس بات کو ختم کریں اور سو جائیں ...... اوکے......؟'' وہ ایک جھٹکے سے اس کے پاس سے اٹھا تھا اور اپنا تکیہ سیدھا کر کے بیچ سونے کے لیے لیٹ گیا تھا۔

پر وہ ساری رات نہیں سو سکی تھی۔ وہ غصے سے کھول رہی تھی۔ وہ جو سوچ رہی تھی وہ سوچنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ اپنی کشتیاں جلا کر یہاں اسپین فتح کرنے آئی تھی۔

☆☆☆

لیکن وہ اگلے ہی دن پہلے جیسا ہو گیا تھا۔ اس کی ہر ادا پر قربان ہوتا، فکر کر کے ناشتا کرواتا، کولون میں مہکتے وجود کے ساتھ اپنی خوش قسمتی پر ناز کرتا...... اپنے پہلو میں ہاتھ لگاؤ تو میلی ہوتی، دودھ اور شہد میں گندھی حسین شہزادی کو لیے اکڑ کر چلتا، وہ دنیا کا سب سے خوش نصیب مرد تھا۔

بھوربن سے دن چڑھے نکلنے کے بعد فاروق کی پجیرو کہیں اور جا رہی تھی ایک اور خوب صورت مقام جو بھوربن ہی کی طرح سرسبز پہاڑوں میں گھرا ہونے کے ساتھ کسی بھی درمیانے درجے کے حسین شہر جیسا تھا۔ فاروق اسے نہ بتاتا تب بھی اس نے سڑک کے کنارے انگلش میں لکھا پڑھ لیا تھا۔ ایبٹ آباد۔

فاروق کہتا تھا کہ اس کے ملک کا نظام آج بھی برطانوی دور کی یادوں کو سینے سے لگائے ہوئے ہے اور اس... شہر کا نام اسی کی ایک مثال تھا۔

یہاں آنا پہلے سے طے شدہ نہیں تھا۔ تبھی ڈرائیور راستوں سے ناواقف معلوم ہوتا تھا۔ انہیں فاروق کے کسی دوست کی پُرزور فرمائش پر یہ دعوت قبول کرنی پڑی تھی۔

ریسٹ ہاؤس کی طرح، لمبے برآمدوں اور ترچھی چھت والا یہ عالیشان بنگلا راستے میں نظر آنے والے کئی مکانوں سے بہت بڑا تھا۔ اس کی بیرونی آرائش پر بے دریغ پیسہ بہایا گیا تھا۔ پانی اچھالتے فواروں کے پاس لان کے درمیان میں ایک بڑا سا پنجرہ تھا۔ رنگین پروں کو پھیلانے اور سمیٹنے میں مصروف پنجرے میں بند مور اسی جنگل میں ناچ رہے تھے۔ جہاں کوئی بھی دیکھنے والا نہیں ہوتا۔

فاروق کا دوست ان کا جی جان سے منتظر تھا۔ پہلی نظر ڈالتے ہی سبرینہ کو لگا اس کا دل کہیں نیچے بہت نیچے کی طرف گرتا جا رہا ہے۔ اسے ڈر نہیں لگا تھا اسے غصہ آیا تھا۔ اسے شکایت ہوئی تھی فاروق سے نہیں اپنے آپ سے۔

فاروق کا کہنا تھا کہ بھوربن میں اس کی بیوی اور فصیح مانڈوی والا کے درمیان جو غلط فہمی پیدا ہوئی تھی اسے دور کرنے کے لیے مانڈوی والا کے اصرار پر اس کی موسم گرما کی رہائش گاہ پر آنے کا فیصلہ قطعاً اس کا ذاتی تھا۔ گو دعوت دینے میں پہل فصیح نے کی تھی۔ لیکن اسے کسی بات پر یقین نہیں آیا تھا۔ ان دو ملاقاتوں میں وہ ایک دوسرے کے اتنے گہرے دوست کب بن گئے۔ اسے کیوں پتا نہیں چلا؟

مگر کبھی میز پر جلتی موم بتیوں کے بیچ دنیا کے بہترین شیف کے ہاتھ سے تیار ہونے والی اٹالین اور فرنچ ڈشز کو ٹھکرانا اس کے شوہر کے نزدیک سخت غیر اخلاقی حرکت ہوتی۔ وہ اپنی مرضی سے یہاں آئے تھے۔ اب میزبان کو بے عزت کیسے کر سکتے تھے۔

رات کا کھانا کھایا اور اٹھایا گیا۔ فصیح مانڈوی والا

نے گہری ہوتی رات کا خمار، سرخ مشروب میں انڈیل کر گلاس فاروق کی طرف بڑھایا تھا۔ جو بڑے ہی اطمینان سے اس کے سامنے کے صوفے میں دھنسا کسی بات پر بے سبب مسکرا رہا تھا۔ اس کے سانچے میں ڈھلی مرمریں بیوی اپنے دراز قد کو شفون کی دل خوش کن ساڑی میں چھپائے ناراضی سے پیٹھ موڑے کھڑی، زمین سے چھت تک بلند کھڑکی کے شیشوں کے پاس اندھیرے میں کچھ تلاش کر رہی تھی۔ مانڈوی والا کی نظریں اس کی پشت کے پیچ وخم کا طواف کر رہی تھیں۔

اس کے سرکل میں خوب صورت عورتوں کی کمی نہیں تھی۔ آسانی سے ہاتھ آنے والی غیر ملکی عورتوں کی بھی نہیں...... مگر اس کے تجربے نے اتنا خام، اتنا خالص، ایسی آن بان والا، غیر ملکی حسن پہلی بار دیکھا تھا۔ وہ آزاد دنیا سے آئی تھی مگر یہیں کی لگتی تھی۔ اس نے انگلیوں پر گن کر دیکھا۔ بھوربن سے اب تک یہ اس کی اس اپسرا پر پڑنے والی پانچویں اتنی بھرپور نظر تھی۔ اس نے اب تک ایک بار بھی اسے روایتی پاکستانی لباس کے سوا کچھ پہنے نہیں دیکھا تھا۔

اسے مشکل سودے کرنے پسند تھے۔ اپسرا کے مالک فاروق سے پہلی ملاقات میں اسے خوب اندازہ ہو چکا تھا کہ وہ اپنی محبوبہ کو جسے وہ کسی وجہ سے بیوی کہنے پر آمادہ ہو گیا ہے ایسی بے ضرر سوشلائزنگ پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ جس سے اس کے لیے ملک کے بااثر کارپوریٹ سیکٹر میں اپنے راستے بنانے کا موقع ہموار ہو......اس نے فصیح مانڈوی والا کے سامنے کوئی اعتراف نہیں کیا تھا......مگر فوج اور حکومت کے علاوہ وہ کراچی کی اسٹاک مارکیٹ اور چیمبر آف کامرس میں اپنی جڑیں گہری کرتی پنجاب کی اس ماڈرن جاگیردار کلاس سے وہ بخوبی واقف تھا۔ جس کے فارن پلٹ انتہائی پڑھے لکھے، بہت گھمنڈی، بہت جلدی سے سب کچھ حاصل کرنے کے خواہش مند over ambitious نوجوانوں کے لیے پاکستان میں حاصل کرنے کو بہت کچھ تھا۔ اور وہ اس کے لیے کوئی بھی قیمت کسی بھی قیمت پر دینے کو تیار تھے۔ اسے ان

سپنوں میں الجھی

سپنوں میں الجھی نادان سی لڑکی
سمندر کنارے مٹی کے گھروندے بناتی
چاندنی راتوں میں چھت پہ کھڑی چاند کو تکتی
ساون کی سنہری شاموں میں باغوں میں جھولتی
گھٹا ٹوپ اندھیری راتوں میں آس کے دیپ جلاتی
تاروں بھرے آکاش پر نظریں جمائے کچھ تلاشتی
دسمبر کی سرد راتوں میں آتش دان پر ہاتھ سینکتی
اپنے خیالوں میں مگن آنکھیں موندے بیٹھی رہتی
اسے اپنے پریمی کا انتظار ہے......
کوئی ہے جو اس کا پریمی ڈھونڈ لائے؟

شاعرہ: مسز نگہت غفار، کراچی

محبت

محبت ریت جیسی تھی
مجھے تھی یہ غلط فہمی
محبت ڈھیر ساری تھی
میں دونوں ہاتھ بھر بھر کر
محبت کو سنبھالوں گا
زمانے سے چھپا لوں گا
کبھی کھونے نہیں دوں گا
مگر...... میں نے اسی ڈر سے
محبت ہی نہ کھو جائے
یہ مٹھیاں بند رکھی تھیں
مگر جب مٹھیاں کھولیں
تو دونوں ہاتھ خالی تھے
محبت کے سوالی تھے
کیونکہ......
محبت تو ریت جیسی تھی

مرسلہ: صدف آصف، کراچی

وسیع زمینوں کے پشت در پشت مالک اپنے باپ دادا کی طرح صرف علاقائی اور صوبائی سیاست پر قناعت نہیں کرنی تھی۔ قومی دھارے کی سیاست سے قومی خزانے تک کی وزارتوں اور محکمہ جات تک اپنی کامیابیوں کے کچھ اہم باب رقم کرنے تھے۔ وہ یقیناً اپنے باپ فیروز معظم خان سے کئی ہاتھ آگے تھا۔

اس نے دیکھا، فاروق اپنا گلاس سائڈ ٹیبل پر رکھ کر اپنی ناراض اپسرا کے پاس گیا تھا۔ اس نے بڑے استحقاق سے اس کی پشت پر ہاتھ رکھا ہوا تھا۔ اور فصیح مانڈوی والا کے دل پر جلن کی آریاں چل رہی تھیں۔ اس کے لیے زیادہ دیر تک اپنے حواسوں کو قابو میں رکھنا مشکل ہو رہا تھا۔

فاروق، سبرینہ کی تنی ہوئی پشت سے کچھ بے حد محبت سے کہہ کر اپنی جگہ دوبارہ جا بیٹھا تھا۔ یقیناً یہی کہ وہ صبح ہوتے ہی یہاں سے چلے جائیں گے۔ تب تک وہ کمرے میں جا کر کچھ آرام کر لے۔

فصیح مانڈوی والا کا دل باغ، باغ ہو گیا۔ جب سبرینہ کے جاتے ہی فاروق نے مسکرا کر فصیح مانڈوی والا کو آنکھوں ہی آنکھوں میں سبرینہ کے پیچھے جانے کا اشارہ کیا۔

اس کے بعد کے واقعات اتنی تیزی سے وقوع پزیر ہوئے کہ متاثرین کو سمجھ ہی نہیں آئی کہ ہوا کیا ہے۔ سبرینہ کے پیچھے کمرے میں پہنچتے ہی مانڈوی والا کا سر زور سے پھینکی ہوئی کسی بہت بھاری چیز کی زد میں آ گیا تھا۔ فاروق دوڑ کر اندر پہنچا تو مانڈوی والا کے سر سے بہتے خون کے فوارے نے اسے بوکھلا کر رکھ دیا۔ شعلہ جوالہ بنی سبرینہ گیبرئیل اپنے دونوں ہاتھوں میں پیتل کا بھاری گلدان دبوچے اگلے حملے کے لیے بالکل تیار تھی۔ گلدان کے پیندے کا باریک کنارہ مانڈوی والا کے خون سے سرخ ہو چکا تھا...... فاروق ایسی ایمرجنسی کے لیے بالکل تیار نہیں تھا۔ مانڈوی والا کو فوراً قریب ترین اسپتال لے جانا پڑا۔ جہاں اس کے پھٹے ہوئے سر میں ایک دو نہیں پورے آٹھ ٹانکے لگے۔ مانڈوی والا صدمے سے پاگل ہو رہا تھا۔ اس نے اپنے سوجے اور اکڑے ہوئے سر کو ٹٹول کر قسم کھائی تھی کہ وہ اس مغرور لڑکی کے دماغ کا خناس ضرور نکالے گا۔ فی الوقت تو اس نے فاروق کو دھمکیاں دے کر اس کا دماغ درست کر دیا تھا۔ جس نے لڑکی کو ذہنی طور پر تیار کیے بغیر یہاں لانے کی حماقت کی تھی۔ پولیس میں رپورٹ درج کرانے کی دھمکیاں سن کر فاروق نے خود کو مانڈوی والا کی منت کرتے اور دل ہی دل میں سبرینہ کو خوب سبق سکھانے کا ارادہ کرتے پایا۔ یہ سب کچھ قطعاً غیر متوقع تھا۔

فاروق کا خیال تھا کہ سبرینہ کی صورت قدرت نے اسے ویسا ہی جیک پاٹ دلوا دیا ہے جیسا کبھی اس کے باپ کے حصے میں آیا تھا۔ اس کا باپ بے وقوف تھا۔ جس نے اپنی کامیابی کی حسین کنجی اپنی پسند کے گھوڑے دشمنوں سے ہتھیانے، ضلع کچہری کے معمولی کلرک اور پٹواریوں کو خوش کرنے اور علاقائی سیاست میں اثر پیدا کرنے میں ضائع کر دی۔ وہ اپنے باپ سے کہیں زیادہ سیانا تھا۔ اس کا باپ کہتا تھا، فاروق میرے خاندان کا دماغ ہے۔ وہ اپنے بھائیوں کی طرح چیفس کالج لاہور گیا تھا، گھڑ سواری، پولو، تیراکی، کرکٹ... اس نے کھیل اور تعلیم دونوں میدانوں میں ہر جگہ اعزاز کے ساتھ کامیابیاں حاصل کی تھیں۔

برطانیہ جاتے ہوئے اس کے باپ نے اپنے باپ کی طرح اس سے اپنی زمینوں پر واپس لوٹنے کا عہد لیا تھا کیونکہ اس میں فائدہ زیادہ تھا۔ وہ اپنے باپ کے نقشِ قدم پر چلنے کے لیے پوری طرح آمادہ بھی تھا۔ اور اسے یقین تھا کہ وہ اپنے باپ سے زیادہ ذہین' اچھی گفتگو کرنے والا، زیادہ اچھی صورت اور عقل کا مالک ہے۔ تبھی اسے سبرینہ جیسی خام اور خالص لڑکی ایسی آسانی سے مل گئی جو اس کے باپ کے شاندار محل کے زبردست ہال میں بجی، اس کی تعلیمی دور کی ٹرافیوں سے کہیں بڑی ٹرافی بن سکتی تھی۔

لیکن ایبٹ آباد کے واقعے نے اسے غصے سے پاگل کر دیا تھا۔ مانڈوی والا کو ٹانکے لگوا کر معاملہ پولیس

میں نہ جانے دینے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا کر جب فاروق میزبان سمیت واپس اس کے بنگلے پر پہنچا تو سبرینہ واپسی کے لیے تیار بیٹھی تھی۔

اس دن فصیح مانڈوی والا کی آنکھوں کے سامنے فاروق فیروز خان کے ہاتھوں سبرینہ گیبرئیل کو پہلا باقاعدہ اور زوردار تھپڑ پڑا تھا۔ تھپڑ اتنا زوردار تھا کہ فصیح مانڈوی والا نے خود کو پہلی بار فاروق سے سخت مرعوب محسوس کیا۔ تھپڑ...... جس نے سبرینہ کے دماغ کو جھنجھنا کر رکھ دیا تھا۔ اس کے پھٹے ہوئے ہونٹ سے نکلنے والا خون اس کے حلق میں جا رہا تھا۔ اس کی آنکھیں بے یقینی اور صدمے سے بھل بھل بہہ رہی تھیں۔

اور وہ خوب اچھی طرح جان چکی تھی کہ کشتیاں جلانے والوں کا انجام ہمیشہ ہی اچھا نہیں ہوتا۔

☆☆☆

اس نے 'اچھی' سے بے تکلف ہونے کے لیے اسے اپنا ایک ننھا سا کروکوڈائل کی کھال والا پرس تحفے میں دینا چاہا تھا۔

'اچھی' کی آنکھیں خوشی سے دمکنے لگی تھیں۔ اس نے ایک منٹ کے لیے پرس ہاتھ میں لے کر، الٹ پلٹ کر دیکھا پھر جیسے اس کے کان میں کوئی بولا تھا۔

''وہ ایک گندے، ننگے لوگوں کے دیس سے آنے والی ایک کافر اور ناپاک لڑکی ہے۔ خبردار، ایسے کافروں سے میل ملاقات رکھنے والوں کو اللہ گناہ دیتا ہے۔ ان پر اپنا عذاب نازل کرتا ہے۔''

'اچھی' کے کان میں اپنی ماں کے سکھائے سبق گونجے، وہ سبق جو اس کی ماں کو، چوہدریوں کی بیویوں نے کافر جادوگرنیوں کے طلسم سے محفوظ رہنے کے لیے پڑھائے تھے۔ وہ اس نجس بٹوے کو چھو کر اپنے ہاتھ ناپاک کر چکی تھی۔ اس نے سہم کر پرس چھوڑ دیا تھا اور بھاگتی، بھاگتی کمرے سے باہر نکل گئی تھی۔ پرس ایک دھپ کی آواز کے ساتھ قالین پر گرا تھا۔ وہ دھک سے رہ گئی۔ اس کی زندگی میں انقلاب ضرور آیا تھا لیکن ابھی [illegible] نہیں ہوئی تھی۔

''وہ اسے کیا سمجھانا چاہتے ہیں اور ایک قابلِ نفرت غلیظ کوڑھی کی طرح اسے ساری دنیا سے کاٹ کر کس بات کی سزا دے رہے ہیں؟'' پھر اس نے اپنے دل کا غبار فاروق کے سنگ مرمر سے بنے محل میں سایوں کی طرح منڈلاتے، خدمت گاروں پر نکالنا شروع کردیا۔ وہ گونگے تھے...... بہرے تو نہیں تھے...... چند ہی دنوں میں، ان کا مالک بیج پا ہو کر اس کے سر پر منڈلانے لگا تھا۔

''تو کیا کروں پھر؟'' اس کی خودسری لوٹنے لگی تھی۔ جواب میں ایک اور زوردار تھپڑ نے اس کے اعصاب جھنجھنا دیے تھے۔

ایبٹ آباد سے آنے کے بعد حالات کبھی ویسے ہوئے ہی نہیں جیسے سبرینہ سوچتی تھی۔ وہ آدمی کبھی جس کے آنے پر اس کا دل کھل اٹھتا تھا، اطراف میں موسیقی بجنے لگتی تھی۔ برف سے ڈھکے دشوار موسم، جس کی آمد کی خوشی سے پُرجوش ہو کر جھومنے لگتے تھے۔ اپنے اصل سے کتنا مختلف تھا۔ یہ کوئی اور ہی شخص تھا، جس نے اس پر اپنا ہر اختیار حاصل کرلیا تھا پھر بھی خوش نہیں تھا۔ وہ اس کے لیے اپنا سب کچھ چھوڑ کر آئی تھی۔ اسے اس سے کوئی غرض نہیں تھی۔ وہ جب بھی سبرینہ کے ساتھ کوئی مہربانی کرتا، اسے سبرینہ سے کچھ ایسا چاہیے ہوتا تھا جسے وہ مان نہیں سکتی تھی۔

پھر بھی وہ خود کو حوصلہ دیتی...... وہ اتنا برا نہیں ہوسکتا...... وہ پیار، محبت سے اسے سمجھا سکتی ہے آخر اسے پہچاننے میں، اس نے کتنی بڑی غلطی کی ہوگی بھلا؟

لیکن جس دن فاروق کے ایک دوست کے شاندار فارم ہاؤس پر جو ایک بڑے سیاسی گھرانے کا چشم و چراغ تھا ہونے والی ایک انتہائی غیر رسمی پارٹی میں سبرینہ گیبرئیل نے مشروب سے بھرا گلاس میزبان کے منہ پر الٹ دیا تھا...... اس دن فاروق نے اس کا دماغ درست کرنے کے لیے گھر واپسی تک کا انتظار نہیں کیا تھا...... وہ فاروق کے محل پہنچ کر گاڑی سے اتری تو اس کا چہرہ سوجا ہوا تھا۔ اور پھٹے ہوئے ہونٹ

سے ابھی خون رسنا بند نہیں ہوا تھا۔
فاروق کے دوستوں کی بے عزتی کرنے کا جرم قابلِ معافی نہیں تھا۔ فاروق سخت خفا تھا۔ جب سے وہ اس کی زندگی میں شامل ہوا تھا، ایسے کتنے ہی تھپڑ اس کے سرخ وسفید رخساروں پر اپنے نشان بنا، بنا کر گزر چکے تھے...... وہ تھپڑ کھائے ہوئے گال کو سہلاتی، نفرت کے ناقابلِ بیان سیلاب میں بہتی اپنی سرکش ہوتی ''میں'' کو سنبھالنے کی کوشش میں بے حال ہو رہی تھی...... وہ کیوں نہیں سمجھ لیتی...... جب تک وہ یہاں ہے اسے حالات سے سمجھوتا کرنے کی عادت ڈالنی ہوگی...... اس نے غصے کا طوفان تھمنے کے بعد اپنے آپ کو بڑے سکون سے تسلی دی تھی۔
مگر وہ کب تک یہاں ہے؟ یہ سوال بھی بہت دلچسپ تھا۔ اپنے ہاتھ پاؤں توڑ کر مفلوج خاموشی سے اس سنگ مرمر کے محل میں ایک ایسے شخص کے اندھے عزائم کی سولی پر چڑھے رہنا کوئی آسان کام تھا ہی نہیں...... بڑی مشکل سے اپنے ضدی اور بات، بات پر الجھ پڑنے والے دماغ کو سمجھا بجھا کر وہ ایک کنارے ہو کر چلنے کی مشق کرنے لگی...... اور ان گونگے ملازموں کو جو مالک سے وفاداری نبھانے پر مجبور تھے۔ ہر روز بلند ہونے والے اس ہنگامے سے نجات مل گئی جو فاروق صاحب کے اپنی غیر ملکی بیوی کے کمرے میں جانے پر اندر سے اٹھتا تھا۔ آوازیں دو برابر کی آتی تھیں...... ایک گرجدار اور غصہ ور مالک کی، بدزبان اور گستاخ رعایا سے جھگڑنے کی آوازیں۔
شاید پھر بھی وہ فاروق سے کوئی اچھی امید باقی رکھ لیتی اگر ایک گہری سیاہ رات میں فاروق نے ایک سیاہ ہیولے کو اپنی اونچی گاڑی کے پہیوں میں لپیٹ کر سڑک پر دور تک گھسیٹا نہ ہوتا۔
وہ بہاول پور میں ایک بڑی شخصیت کے فنکشن سے موضع محمد خان واپسی کے راستے میں تھے جب یہ دل دہلا دینے والا واقعہ پیش آیا۔ بس ایک لمحے کی بات تھی۔ سب آناً فاناً ہو گیا تھا۔ سبرینہ نے ایک سائے کو دور سے سڑک پار کرتے دیکھا تھا اس نے فاروق کو دھیان سے گاڑی چلانے کو بھی کہا تھا...... مگر ایک تھڈ کی آواز کے ساتھ گاڑی سے ٹکرانے والا، وہ ایک انسانی ہیولہ ہی تھا۔ وہ حلق سے چلا رہی تھی...... فاروق کی قمیص کا بازو کھینچ کر اسے گاڑی روکنے کو کہہ رہی تھی...... فاروق کا نشہ ہرن ہو گیا تھا...... وہ سیاہ ہیولہ اب ان کے پیچھے نہیں تھا...... فاروق نے کچھ آگے جا کر گاڑی روکی۔ سبرینہ کو ڈپٹ کر خاموش رہنے کا حکم دیا لیکن سبرینہ خود کو اس کے پیچھے اترنے سے نہ روک سکی۔
فاروق کو گاڑی کے پچھلے پہیے پر جھکے دیکھ کر اس کا دل حلق میں آ گیا تھا۔ گاڑی کا پچھلا پہیہ گیلا، گیلا سا تھا۔ پہیے سے جو ٹپک رہا تھا...... وہ پانی نہیں تھا...... کسی کے ادھڑے ہوئے جسم کی باقیات اب بھی پہیے میں لپٹی ہوئی تھیں...... وہ جو بھی تھا...... زندہ ہوتا تو ضرور کوئی اسے بیٹا، بھائی یا شوہر کہتا...... اس وقت مگر ایسا کوئی انسانی رشتہ اس کے کچلے ہوئے سر اور خون میں لتھڑے ہوئے بالوں کو سہلانے کے لیے اس خاموش سڑک پر موجود نہیں تھا۔
سبرینہ خوف سے کانپ رہی تھی۔
''ہمیں پولیس کے پاس جانا چاہیے۔'' جیسے بیکار مشورے، فاروق نے سنے ہی نہیں...... جیسے اس کے کانوں پر بھی اس کے ضمیر کی طرح مہر لگ چکی تھی۔ اس نے اِدھر اُدھر گردن گھما کر دیکھا۔ خاموش تاریک رات میں، اس کے جرم کی گواہی کس کو دینی تھی۔ کسی کو نہیں......
اس نے وڑائیونگ سیٹ سنبھالی...... باقی کا سفر طے کیا اور خون اور گوشت میں لتھڑی پراڈو اپنے سنگِ مرمر کے ڈرائیو وے میں چھوڑ کر چابی اسلحہ بردار، باوردی گارڈز کے حوالے کر دی۔
اب ان کا کام ہے کہ وہ گاڑی کو غسل دے کر چمکا کر صبح تک ڈرائیو وے میں واپس کھڑی کر دیں...... بس۔
ایک گوشت پوست کی سانس لیتی زندگی کی اتنی حقیر قیمت لگتے، سبرینہ کھلی آنکھوں سے پہلی بار دیکھ رہی تھی...... یہ رات بھی سبرینہ گیبرئیل کی اب تک کی

زندگی کی بھیانک ترین راتوں میں سے ایک تھی......

اس نے اس شخص کو جسے دل کی پوری رضا کے ساتھ اپنے خونی رشتوں کو ناراض کر کے اپنے لیے چنا تھا۔ جس کے بارے میں اسے یقین تھا کہ اس سے اس نے محبت کی ہے۔ اپنی آنکھوں کے سامنے اپنے دل میں خاموشی سے اس محبت کو آخری ہچکی لیتا دیکھ رہی تھی۔

یہ کیسا خوفناک تجربہ ہے۔ شاید اسے وہی سمجھ سکے، جس نے اپنی آنکھوں کے سامنے ایسی موت ہوتی دیکھی ہو۔

مگر وہ سمجھ گئی تھی۔

ان کے بیچ تناؤ تھا اور بڑھتا جا رہا تھا...... اب وہ کچھ دنوں کے وقفے سے آنے لگا تھا...... وہ جانتا تھا، وہ اسے خوب اچھی طرح سہانے میں کامیاب ہو گیا ہے...... کچھ دنوں میں وہ راہ راست پر آجائے گی۔

لیکن وہ اسے کچھ وقت دینا چاہتا تھا۔

وہ جانتا تھا وہ اس کے باپ کی زمینوں پر فالسے چننے والی کسی مزارعے کی لڑکی نہیں۔ وہ چاہے تو دنیا ہلا سکتی ہے حالانکہ ذہانت اور عقل کے سارے میڈل اندھا دھند اپنے باپ کی طاق پر چھوڑ کر اس نے ثابت کر دیا تھا کہ وہ ایک مزارعے کی لڑکی سے زیادہ کچھ بھی نہیں۔

☆☆☆

پھر اسے مزید سہانے کے لیے ایک نئی چال چلی گئی۔

اس کے کمرے میں کھانا پہنچانے، صفائی کرنے دن میں 'اچھی' کے علاوہ ایک دوسری عورت بھی چکر لگاتی تھیں۔ اسے شبہ سا ہوا وہ بڑی عمر کی عورت جس کی مقامی لہجے والی اردو وہ کسی حد تک سمجھنے لگی تھی، اس کے کمرے میں غیر ضروری رک کر گاہے گاہے بے تکلف ہونے کی کوشش کر رہی ہے۔ چھوٹے، چھوٹے فقرے...... اشاروں کی زبان...... ان دنوں وہ عورت اس کے کمرے میں کچھ زیادہ ہی آنے لگی تھی۔

ایک دن اس عورت نے اس کے پاس دو زانو بیٹھ کر راز داری کا وعدہ لے کر آس پاس دیکھ کر جیسے ابھی کوئی آکر اس کا گلا دبا دے گا...... سبرینہ کو مخل کے

ایک اور خونچکاں راز میں شریک کیا...... ایسا راز جس سے اس ضدی گردن اور اٹھے ہوئے سر والی خودسر لڑکی کو خوب اچھی طرح ڈرایا جا سکتا تھا۔ وہ اسے ساکن اور خوف سے دم بخود چھوڑ کر باہر نکل گئی تھی جیسے پکڑے جانے کے خوف سے بھاگی ہو۔

لیکن اس کے پیچھے زوردار آواز سے بند ہوتے دروازے نے سارے راز کھول دیے۔ یقیناً وہ عورت کسی خاص مقصد کے بغیر تمام دفاعی انتظامات کی آنکھوں میں دھول جھونک کر یہاں ٹھہری بھی نہیں ہو گی۔

یہ کہانی اتنے اہتمام سے اسے کیوں سنائی گئی تھی۔ اسے سمجھنے میں زیادہ وقت نہیں لگا۔ یہ کہانی ہر اس انسان کو سنائی جاتی ہے جس کے لیے اس کا جاننا بہت ضروری ہے۔

وہ لڑکی جو کچھ سال پہلے فاروق کے بڑے بھائی کے ساتھ کسی ٹھنڈے ملک سے یہاں آئی تھی اور جس نے صاحب کے کسی دوست سے دوستی لگالی تھی اس نے فاروق کے بڑے بھائی سے الگ ہونے کا مطالبہ کیا تھا پھر کسی کے ساتھ بھاگ گئی تھی۔ مالک کے وفادار کتوں نے ایک گھنٹے میں اسے ڈھونڈ نکالا تھا۔ یہ وہ کہانی جو اس عورت کی زبانی اس نے سنی تھی۔

سبرینہ کو اس کی بات کا یقین نہیں آیا تھا۔

"کہاں ہے وہ لڑکی اب؟" اس کے منہ سے نکلنے والے فقرے کا کوئی مطلب نہیں تھا۔

"لو بی بی...... مالکوں سے بے وفائی کرنے والے زندہ تھوڑی بچتے ہیں۔" عورت کو اس کی حماقت پر افسوس تھا۔

"مر گئی کم بخت...... اسے سانپ نے کاٹا تھا۔ یہ ساتھ والے کمرے میں تو رہتی تھی۔ اگلے دن جب دروازہ کھولا تو کمرے سے اس کی لاش نکلی...... نیلا بدن...... منہ سے بہتا جھاگ......"

بے شک، جس زہریلے سانپ نے اس لڑکی کو ڈسا تھا اسی کی نسل کے دوسرے سانپ، آج اس نئی لڑکی کے گرد سر سراتے پھر رہے تھے۔ کالے، سیاہ، لپکتی

زبانوں والے۔

”پھر......؟“

”پھر کیا بی بی...... اسے راتوں رات حویلی کے پیچھے جو کنواں نہیں ہے اس کے اُدھر فالسے کے باغ سے پرے مٹی میں دبا دیا۔ اس کا جنازہ جائز جو نہیں تھا۔“ اس کے کان سائیں، سائیں کر رہے تھے۔

”اس کا جنازہ کیوں جائز نہیں تھا؟“

”ایک تو وہ مسلمان نہیں تھی اور پھر اس نے کسی کے ساتھ منہ جو کالا کیا تھا۔“ عورت پھر بولی تھی۔

”پر تھی بڑی کرموں والی، بڑے میٹھے فالسے لگتے ہیں اس زمین پر...... آج جو دوپہر کو فالسے نہیں لائی تھی...... میں وہ اسی زمین کے تو ہیں۔“ عورت نے اپنا بیان ختم کر کے ایک نظر سائڈ ٹیبل پر رکھی خوب صورت ٹوکری پر ماری۔

”ہائے بی بی، تم نے چکھے بھی نہیں...... بہت میٹھے ہیں کھا کر دیکھو تو......“ وہ لپک کر ٹوکری اٹھا لائی تھی۔

سبرینہ دہشت کی زیادتی سے سن بیٹھی تھی۔

انسانوں کے سر قلم کر کے کھوپڑیوں کے مینار بنانا کتنی بڑی عظمت کی نشانی ہے...... اور جنگلوں کے یہ خونخوار جانور، کب سے انسانی بستیوں میں خون اور گوشت کی ایسی کہانیاں لکھ رہے ہیں...... کون اسے بتاتا؟ وہ بزدل نہیں تھی۔ لیکن زندگی کی ایسی کھلی زیادتی اسے پسند نہیں آئی...... اسے اتنی بے رحمی سے، ایسے بھیانک حادثوں کے منہ پر دے مارا گیا تھا کہ اس کی سوچ ماؤف ہو گئی تھی۔ اسے یاد نہیں تھا...... اس نے یہاں آنے کے فیصلے کے سوا زندگی میں ایسا کون سا گناہ کیا تھا۔

اس نے بند کھڑکی کے شیشے کھول کر وقفوں، وقفوں سے چلتی ہوا کو سانس میں بھرنا چاہا...... خاموش رات، دور اندھیرے میں ٹمٹماتے ستاروں کی طرح چپ چاپ تھی۔

”کیسی ہوگی وہ لڑکی......؟“ اس نے سوچا۔

”کیا اس جیسی......؟“

اس لڑکی کی موت سے جو کہانی ادھوری رہ گئی تھی، اس دوسری لڑکی کی یہاں موجودگی اسی کہانی کی تکمیل کی کوشش ہے...... اسے لگا کسی کے سسکنے کی آواز سنائی دی ہو...... اور یہ جان کر اسے کوئی خوشی نہیں ہوئی کہ یہ آواز اس کے اپنے حلق سے برآمد ہوئی تھی۔

”آج اگر اسے بھی کوئی سانپ ڈس لے تو کیا...... وہ بھی کسی مرے ہوئے، لاوارث کتے کی طرح، گمنام مٹی کے ڈھیر تلے، پھول اور پھل سینچنے کے لیے دبا دی جائے گی۔ کسی کو پتا بھی نہیں چلے گا۔ آج اس کی سرکش طبیعت کو کافی افاقہ ہوا تھا۔ وہ سبق جو آزاد دنیا کے کسی بھی فرد کو کسی بھی اور طرح سکھانے ممکن نہ ہوں وہ اس نے ایسی اسرار سے بھری رات میں خود بخود دیکھ لیے تھے۔

اس کی کھڑکی کے نیچے چرمراتے پتوں کی...... کھڑکھڑاہٹ ہوئی تھی...... جیسے کوئی چلا تھا پھر جیسے کوئی رک گیا تھا...... یہ اس کے لیے تنبیہ تھی...... رات کے اس پہر، کھڑکی کھولے رکھنے پر وارننگ کہ اس کے کمرے کی ہر حرکت پر نظر رکھی جا رہی ہے...... وہ بے مزہ ہو گئی...... وہ بھاگ کر جا کہاں سکتی ہے۔

وہ بستر پر گر کر چھت تکنے لگی...... کتنے خوب صورت عزائم لے کر آنے والوں کے لیے وہ عبرت کا نشان بنتے جا رہی ہے۔ یہ معلوم کرنے کے لیے اسے کسی کیلکولیٹر، کسی جمع، تفریق کے آلے کی ضرورت نہیں تھی۔

☆☆☆

اپنا بچہ کھونے کے بعد کئی دن تک وہ خواب میں ایک ہیولہ دیکھتی رہی۔ جس نے اسے آواز دی تھی...... جس نے اسے پکارا تھا۔ جس نے اسے خون کے تالاب میں گرے دیکھ کر کسی کو مدد کے لیے آواز دی تھی۔ ہوش میں آنے کے بعد اس نے اپنے کمرے میں کھانا دینے والی 'اچھی' سے پوچھا تھا۔

مگر 'اچھی'، بے وقوف کو حویلی کے راز کھولنے کی اجازت نہیں تھی...... ویسے وہ ہمدرد تھی۔ خوفزدہ آنکھوں میں کبھی، کبھی چپکے سے جھلملاتی مسکراہٹ میں، اس کا

وہ بچپن صاف دکھائی دیتا تھا جو سبرینہ جانتی تھی۔ اس محل کی موٹی دیواروں میں کسی بھی وقت چوری ہو جائے گا۔ وہ جان گئی تھی۔ تاریخی طور پر یہ رہائش گاہ اس خاندان کے وہ شوق پورے کرنے کے لیے مخصوص تھی جو اپنی خاندانی بیویوں کی رہائش گاہ سے الگ پورے کرنے ضروری ہیں۔

اسے کہیں آنے جانے کی اجازت نہیں تھی...... کسی کو اس سے بات کرنے کی اجازت نہیں تھی لیکن وہ سفید چادر والا ہیولا اس کے دماغ میں اٹک کر رہ گیا تھا...... وہ خاموش وجود جسے اس نے اکثر اپنی کھڑکی سے پرے دور کیاریوں سے فالتو جڑی بوٹیاں اکھاڑتے دیکھا تھا۔ وہ کون تھی آخر......

اسے لگتا تھا کہ وہ ہمیشہ ایسی زندگی نہیں گزار سکتی...... مگر تکلیف کی مسلسل کیفیت میں، بہت سے لمبے دن اور راتیں کاٹ چکنے کے بعد اسے احساس ہوا کہ شاید ساری زندگی ایسے ہی گزارنی پڑے۔

اس نے انگلیوں پر حساب لگایا...... اسے اس جہنم واصل ہوئے اس مہینے پورے دو سال ہو گئے تھے۔ دو سال سے وہ قیدِ تنہائی کے لغوی معنی پر تحقیق کر رہی تھی...... قیدی نمبر فلاں، کوٹھڑی نمبر ڈھمکاں......

اس دن دوپہر کو کھانا دینے 'اچھی' یا وہ دوسری عورت نہیں آئی تھی۔ ماتھے پر آنکھوں تک چادر کھینچے، وہ کوئی اور تھی...... کھانے کی ٹرے بیڈ کی سائڈ ٹیبل پر اٹکا کر جانے والی کی پشت کو سبرینہ نے غور سے دیکھا اور اچھل پڑی۔

''رکو......!''

''تم وہی ہو ناں......؟''

ہلکے رنگ کی لمبی چادر میں لپٹی پشت، کمرے سے نکلتے نکلتے ٹھٹک گئی تھی۔

سبرینہ کے منہ سے نکلنے والے الفاظ صاف اردو میں ادا ہوئے تھے۔ جس پر مقامی بولی کا زبردست اثر تھا...... یقیناً 'اچھی' ایک اچھی ٹیوٹر ثابت ہوئی تھی۔

اس کے ہاتھ دروازے کی ناب پر تھم گئے تھے۔

''تم یہاں آئی تھیں ناں...... جب میں نے اپنا بچہ کھویا...... تم وہی ہو ناں......؟'' ساکت ہو کر تھمی پشت میں کوئی حرکت نہیں ہوئی۔ وہ جو بھی تھی سبرینہ کی آواز میں شامل حیرت اور خوشی کا اندازہ لگا سکتی تھی۔ اور پیچھے مڑ کر دیکھنے سے پتھر کی بھی ہو سکتی تھی۔

وہ کون تھی...... یہ بتانے سے کیا حاصل...... ہاں مگر وہ اپنے جیسی ایک اور عورت کو اپنے جیسے انجام سے دوچار ہوتا دیکھ رہی تھی۔ اگر کوئی اس سے پوچھتا تو وہ ضرور...... کہتی کہ وہ اس پر بالکل خوش نہیں ہے مگر وہ جانتی تھی اس سے ایسے سوال کوئی نہیں کرے گا۔

شاید ابھی وہ کچھ اور پیچھے مڑ کر دیکھنے یا نہ دیکھنے کی الجھن سے نہ نکل پاتی اگر اس کے دروازے کی ناب پر رکھے ہاتھ کو ایک ملائم ہاتھ نے آہستگی سے چھو نہ لیا ہوتا۔

سبرینہ گیبرئیل فاروق خان اس کے بالکل قریب کھڑی اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھے اس کا شکریہ ادا کر رہی تھی۔

سبرینہ نے دیکھا اس کی جھکی ہوئی سنہری پلکوں کے گرد باریک جھریوں کا جال تھا...... جب اس نے سبرینہ کی طرف نظر اٹھائی تو اسے لگا صدیوں کے ٹھہراؤ والے بے تاثر چہرے پر ہزاروں سالوں کی تھکن لکھی ہوئی ہے اور کبھی یقیناً خوب صورت رہ چکنے والی مٹے، مٹے نقوش کے بیچ رکھی دو نیلی آنکھیں بولتی ہیں۔

''کیسا شکریہ......؟'' اس نے سبرینہ کے ہاتھ کے نیچے سے اپنا ہاتھ آہستگی سے کھسکا لیا اور مسکرا کر بولی تو اس کی آواز میں کسی تھکن کا شائبہ نہیں تھا۔

''مجھے تمہارے نقصان کا افسوس ہے۔ کاش میں اس دن تمہارے لیے کچھ زیادہ کر سکتی۔'' بے عیب برطانوی انگلش میں ادا ہونے والے الفاظ سمجھنے میں اسے جتنی وقت نہیں ہوئی اتنی ان کے مطالب پر یقین کرنے میں دشواری پیش آئی تھی۔ کتنی دیر تک حیرت کی زیادتی سے اس کے منہ سے ایک لفظ نہیں نکل سکا۔

''کون ہو تم......؟'' وہ بولی تو اس کی آواز کسی کنویں سے آ رہی تھی۔ عورت نے دیکھا، سبرینہ پر حیرت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا تھا۔

''اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا، مجھے خوشی ہے کہ تم ٹھیک ہو۔''

اس کی شکل پر کوئی پریشانی، کوئی حیرت نہیں تھی جیسے وہ دونوں ہمیشہ سے اسی طرح دروازے پر ایک دوسرے کی خیریت پوچھنے کی عادی رہی ہوں۔

سبرینہ کو لگا، اس کا دل کسی گہری کھائی میں گرتا جا رہا ہے۔ ان شکست کھائی، تھکی ہوئی، نیلی آنکھوں میں اس نے اپنا انجام بھی صاف پڑھ لیا تھا۔ اب اسے کوئی خوش فہمی نہیں رہی تھی۔

کیوں...... کیوں...... کیوں آخر......؟ یہ نویں صدی قبل مسیح نہیں ہے۔ یہ کوئی فراموش کردہ تاریخ نہیں ہے۔ وہ کسی پرانی گپھا کے اندھیروں میں مٹی اور دھول میں دفن، گمشدہ نسخے اور کتابیں نہیں ہیں۔ جنہیں سورج کی روشنی دیکھنا نصیب نہیں ہوتی۔ وہ جیتے جاگتے، سانس لیتے، چلتے پھرتے انسانی وجود ہیں...... جنہیں زندہ زمین میں گاڑا گیا ہے...... آج کی دنیا میں ایسے کیونکر ممکن ہو سکتا ہے......؟ کیا واقعی ان عورتوں کا گناہ اتنا بڑا ہے کہ انہوں نے اپنے خدا کی بنائی دنیا میں سانس لیتے اربوں انسانوں میں سے کسی ایک کو اپنے لیے خود چننے کا بنیادی انسانی حق استعمال کیا۔ مگر ان کا خدا ساری دنیا کا خدا اتنا ناانصاف، اتنا ناراض، اتنا سنگ دل کیسے ہو سکتا ہے؟

کیوں......؟ کیوں......؟ آخر کیوں......؟

☆☆☆

''یہ میں ہوں...... میکنا کارٹا...... میگی......''

اس کی کہانی سننے کے لیے سبرینہ کو زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا تھا...... وہ جیسے خود بھی اپنے بارے میں، اپنے ہی جیسے ایک دوسرے کردار سے کچھ بانٹنا چاہتی تھی۔

''حیران مت ہو...... یہاں میرے بہت سے نام ہیں...... کچھ لوگوں کے لیے میں انگریز ہوں، کچھ کے لیے میم صاحب، کچھ کے لیے سفید چمڑی والی اور کچھ

کے لیے کافر...... حالانکہ اس محل کی دہلیز پار کر کے اندر آنے سے پہلے یہاں سے بہت دور اپنی دنیا کی ایک مسجد کے امام کے سامنے اپنا مذہب تبدیل کیا تھا میں نے...... میرے باپ، میری ماں اور میرے چرچ کے فادر نے مجھے عقیدے کی جو تعریف سکھائی تھی اس کی روشنی میں، میں اتنا ہی اندازہ لگا سکی کہ پالنے والے اور بنانے والے کے جو بھی نام ہوں وہ ایک ہی تصویر کے مختلف روپ ہوتے ہیں۔ میرے باپ نے میرا نام کیا سوچ کر۔ رکھا تھا معلوم نہیں...... مگر میں اپنے اس نام کے ہاتھوں اسکول میں ہمیشہ مذاق کا نشانہ بنی......"

میگی بول رہی تھی۔ رات گزر رہی تھی۔ وقت ٹھہرا ہوا تھا۔ رکے ہوئے پانی کے جوہڑ کی طرح...... جس سے حبس آلود گرم ہوا کی لپٹیں اٹھ رہی تھیں۔

اسکول میں مذاق سے بچنے کے لیے اس نے اپنے آپ کو میگی کہلوانا شروع کر دیا تھا۔ اپنے باپ کو اس نے مشرقی لندن کی ایک نچلے درجے کی آبادی میں اپنے مختصر سے گروسری اسٹور اور کافی شاپ میں... بہ مشکل اپنا آپ سنبھالے ہوئے ہی پایا۔ اس کا باپ ولیم ہیملٹن صبح سے شام تک وہیل چیئر پر بیٹھا اسے اور اس کی ماں کو اپنے ایک عجیب و غریب عشق کی داستان سناتا نہیں تھکتا تھا۔

ولیم ہیملٹن مشرقی لندن کے ایک پسماندہ علاقے میں ایک یتیم خانے میں پلا بڑھا تھا۔ صرف سترہ سال کی عمر میں وہ شاعر، ادیب یا مصور ہو سکتا تھا۔ اس میں کسی آرٹسٹ کی روح تھی...... مگر جس دور میں اس نے ہوش سنبھالا...... برطانیہ کے نچلے طبقے کے نوجوانوں کو بحری جہازوں میں مزدور یا سیلر بھرتی ہونے کے سوا کوئی روزگار دستیاب نہیں تھا۔

یہ انیس سو سترہ کا زمانہ تھا۔ دنیا کی عظیم طاقتیں بیسویں صدی کی اولین جنگِ عظیم میں الجھی، ایک دوسرے کے دانت کھٹے کر رہی تھیں۔ دشمن کو خندقیں کھود کر، ست رو زمینی جنگ میں الجھایا جا چکا تھا۔ ...... اپنی بحری طاقت مضبوط کرنے کے لیے اسلحے کے ذخائر جمع کرنے میں مصروف تھا اور توپوں کے دہانوں پر باندھنے کے لیے انسانی جسم درکار تھے۔ جنگ کا چارہ بننے والے بیکار انسانی جسم جنہیں بحری بیڑوں میں دھڑا دھڑ سیلر بھرتی کیا جا رہا تھا۔

وہ پہلے بندرگاہ پر سامان ڈھونے والا مزدور بنا۔ پھر شاہی بحریہ میں سیلر......اور پھر فوج میں بھرتی ہو گیا۔ وہ سخت زندگی سے گھبرانے والا نہیں تھا...... لیکن سمندر اور زمینی فوج دونوں زندگیاں اس کے مزاج کے مطابق نہیں تھیں۔ اس کا دل کھل اٹھا، جب اسے پہلی مرتبہ ہندوستان بھیجا گیا۔ یہ فوج کی ملازمت شروع ہونے کے اولین دو سالوں کا قصہ تھا۔ اسے معلوم تھا، ہندوستان کی تعیناتی اس جیسے کم تجربہ کار رنگروٹوں کے لیے سنہری مستقبل کے لیے پروانہ ثابت ہو سکتی ہے۔ وہ بہت خوش تھا۔ اس نے سیلر بھرتی ہونے سے پہلے اپنے مختصر سے پسماندہ علاقے کے سوا کچھ نہیں دیکھ رہا تھا۔ اس نے سمندری فوج کی ملازمت کے ابتدائی مشکل دنوں کے سوا کبھی کہیں سفر بھی نہیں کیا تھا۔

ہندوستان کتنی دور تھا...... وہ وہاں سے واپس لوٹے گا یا نہیں...... اسے اس میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ دلچسپی تھی تو ایک بات میں کہ وہ ہندوستان جا رہا تھا۔ جس کے بارے میں اس نے بہت کچھ سنا اور پڑھ رکھا تھا۔ پھر بھی کسی چیز نے کسی کتاب یا اخبار میں چھپی خبر اور تصویر نے اسے اس ہندوستان کے لیے تیار نہیں کیا تھا۔ جس کی زمین پر اس نے کئی ہفتوں کے بعد پانی کے جہاز سے اتر کر پہلا قدم رکھا...... وہ سوچ نہیں سکتا تھا کہ فوج کی ملازمت اس کے لیے داستانِ الف لیلیٰ ثابت ہو سکتی ہے...... اس پر جادو ہو گیا۔

بعد کے سالوں میں زندگی اس پر مہربان رہی...... وہ ترقی کرتے، کرتے سنہری ہندوستان میں تعینات برٹش فوج کا درمیانے درجے کا افسر بن چکا تھا۔ فوج کی ملازمت کے دوران اس نے دلی، پشاور، مردان، پنڈی اور لاہور کی فوجی چھاؤنیوں میں اپنے ایسے خوابوں کو حقیقت بنتے دیکھا...... جنہیں کھلی

آنکھوں سے دیکھنے کی جرأت وہ کبھی نہ کر پاتا۔

اس نے اپنی عمر کا سب سے خوب صورت وقت ہندوستان میں گزارا...... جہاں سانولی سلونی، ہندوستانی اپسرائیں حسین ساڑیوں اور خوش رنگ غراروں میں ملبوس، برٹش کلبز میں اپنے قریبی رشتوں کے ساتھ بہار کے رنگ بن کر اترتی تھیں۔ جہاں برطانوی راج نے دور تک پھیلی سرسبز زمینی اراضیوں کا کنٹرول، سانولے سلونے چہروں والے کچھ پڑھے لکھے، کچھ ان پڑھ مگر محفل کے آداب سے واقف زمینداروں کے ہاتھ میں دے کر اپنی حکومت کی طنابیں مضبوطی سے کھینچ رکھی تھیں۔ جاگیردار کہلانے والے ان زمینداروں کو وفاداری کے انعام میں ملنے والی زمین کا رقبہ اس قدر زیادہ تھا کہ صبح سے شام تک گھوڑا دوڑاتے رہنے پر بھی ختم نہ ہوتا تھا۔

ولیم ایک ایسے عشق میں مبتلا تھا جو اس کی بعد کی تمام زندگی کے ہر حسین خواب پر حاوی ہوگیا۔ وہ دل پھینک تھا۔ حاضر دماغ تھا اور ہندوستان کے عشق میں اس حد تک غرق تھا کہ اگر اپنے ایک آفیسر کی بہن اور بیٹی کو اپنی حفاظت میں لے کر پنڈی سے پشاور تک سفر نہ کرنا پڑتا۔ افسر کی بیٹی، اس پر اپنا دل ہار نہ بیٹھتی اور اپنے باپ سے جو رینک میں اس کا سینئر تھا، انعام میں اس کا جونیئر نہ مانگ لیتی...... تو وہ ایک انڈین سول سرونٹ کی بہن کو مسز ہیملٹن بس بنا ہی چکا تھا۔ لیکن حیرت انگیز طور پر شادی اس کے لیے ایک آسان تجربہ ثابت ہوئی۔ جیسے سفر کے دوران اچانک اس کا گھر آگیا۔ اس کی کم عمر اور متحمل مزاج بیوی کیتھرین نے بعد کے چند سالوں میں اس کی زندگی میں کوئی خلا پیدا نہیں ہونے دیا۔

اب ان کی ایک بیٹی بھی تھی میگی...... میکنا کارٹا...... یہ نام اس نے تاریخ کی ان ہی کتابوں سے لیا تھا جنہیں پڑھنا اب اسے زیادہ دلچسپ معلوم نہیں ہوتا تھا۔

اب وہ ایک نئی تاریخ لکھنا چاہتا تھا۔ ہندوستان میں اپنے قیام کی تاریخ...... انسانوں اور اسرار سے بھرے سنہری، سرسبز ہندوستان کی تاریخ...... جہاں اس نے بہت سی کہانیاں سنیں۔ بہت سے دوست بنائے۔ بہت سی محبتیں پائیں اس زمین سے جس پر وہ انگریز راج کا معمولی افسر تھا شاید اس کا عشق ابھی مزید سر چڑھ کر بولتا۔ اگر بدقسمتی نے اچانک اس کے گھر کا راستہ نہ دیکھ لیا ہوتا۔

اس رات لاہور کے برٹ ہال کے قریب گھوڑے کا پاؤں کسی چیز پر رپٹنے سے تانگا الٹ گیا تھا۔ وہ کوچوان کی پچھلی نشست پر بیٹھا پکے ہوئے پھل کی طرح زمین پر آگرا تھا۔ تانگے کا ہڈ اس کے اوپر گرا اور اس کی ٹانگ دو جگہ سے کچلی گئی تھی۔ اسے اسپتال پہنچایا گیا لیکن ٹوٹی ہوئی ہڈی کی نوک، اس کی پوری ٹانگ کو زہریلا کر رہی تھی۔ چھ دنوں میں جان کے لالے پڑنے پر ڈاکٹر کو اس کی ٹانگ کاٹنی پڑی۔

لیکن شاید ٹانگ کھونے کی تکلیف کم ہو جاتی۔ اگر اسے اپنی بیوی کی زبردست ضد کے سامنے ہار مان کر ہندوستان کو خیر باد نہ کہنا پڑتا...... انیس سو بیالیس میں، جب اسے اپنی ایک سالہ بیٹی اور بیوی کے ساتھ لاہور سے کراچی اور پھر کراچی سے اپنے اصلی وطن کے لیے روانہ ہونا پڑا۔ اس وقت دوسری جنگ عظیم اپنے عروج پر تھی۔ لندن کا مشرقی علاقہ جرمنوں کی بمباری سے بری طرح متاثر ہوا تھا۔ جنگ کی تباہی سے شکستہ حال شہر میں، ایک معذور کی زندگی گزارنے کا تجربہ شاید اتنا جان لیوا نہیں تھا۔ جتنا اس ماحول اور اس آب وہوا میں سانس نہ لے سکنے کا خیال اسے بعد کی پوری زندگی تکلیف دیتا رہا۔

فوج سے ریٹائرمنٹ کی زندگی معزول حکمران کی سی زندگی تھی۔ ریٹائرمنٹ پر ملنے والی رقم سے اس نے مشرقی لندن میں اپنی بیوی کے مشورے پر ایک مختصر سا گروسری اسٹور اور کافی شاپ خرید لی تھی۔ کچھ پنشن کی رقم سے گزارہ ہوتا تھا اس کی بیوی سارا دن اسٹور کی دیکھ بھال کرتی اور اس کی بیٹی اس کے پاس بیٹھ کر

کہانیوں کی تصویریں بنایا کرتی تھی۔

برطانیہ نے انیس سو سنتالیس میں اپنی ہندوستانی نوآبادی کو دو ملکوں میں تقسیم کر دیا مگر ولیم ہیملٹن اپنی موت تک دلی اور لاہور کو ایک ہی ملک کا حصہ سمجھتا رہا۔

میگی کو پتا بھی نہیں چلا کہ اپنے باپ سے سنی ہندوستان کی ادھوری کہانیاں، اس کے بچپن کی... یادداشتوں کا کیسے حصہ بن گئیں۔ اس کا بچپن جو اپنے خواب دیکھنے والے باپ کی آنکھوں میں دور کہیں پریوں کی ایک کہانی بنتے گزرا تھا۔ جس میں شہزادی سنہری شہزادے کے ساتھ برق رفتار گھوڑے پر سوار کسی انجانی منزل کی طرف رواں تھی اور شہزادہ دنیا کی ہر مشکل سے اسے بچاتا، گھوڑے پر بٹھائے سرپٹ دوڑا چلا جا رہا تھا۔

اسے کبھی لگا ہی نہیں کہ وہ جس سنہری دیس کے قصے اپنے باپ سے سنتی آئی ہے۔ اسے اس نے حقیقت میں کبھی نہیں دیکھا۔ اس نے اپنے باپ کو فخر سے کہتے سنا تھا کہ میگی ایک برٹش ہندوستانی ہے۔ وہ لاہور کے فوجی اسپتال میں پیدا ہوئی تھی اور اگر اس کی ماں راضی ہوتی تو وہ اپنی میگی کی ہندوستان میں ہی پرورش کرنا پسند کرتا۔

اس کی اٹھارھویں سالگرہ سے کچھ دن پہلے اس کا باپ ایک دن چپ چاپ اپنی وہیل چیئر میں ختم ہو گیا تھا۔

☆☆☆

باپ کی موت کے بعد میگی کو پتا چلا کہ اس کی ماں کس قدر دکھی تھی، اپنی زندگی سے...... اس کی سختیوں سے اور ہندوستان کے عشق میں غرق اس کے ناکارہ باپ کو دنیا سے رخصت ہوئے دو سال ہو چکے تھے۔ اس کی ماں نے اپنے اسٹور اور کافی شاپ کی آمدنی مسلسل کم ہونے کے بعد اپنے ہی علاقے کے ایک زندہ دل رنڈوے بزرگ سے شادی کر لی تھی۔

اسے ماں کے شادی کرنے پر اعتراض نہیں تھا بلکہ دولھے کے بیاہ کر گھر آ جانے پر اعتراض تھا۔

اس نے خاموشی سے اپنا ٹھکانا الگ کر لیا۔

اس کی ڈرائنگ اچھی تھی۔ اسے کہانیوں کے کرداروں کی تصویریں بنانا اور ان میں رنگ بھرنا پسند تھا۔ اسے لندن کے ایک قدرے سستے آرٹ اسکول میں داخلہ مل گیا۔ اسکول کے اخراجات پورے کرنے کے لیے اس نے بچوں کی کتابیں چھاپنے والے ایک پبلیشر کے دفتر میں کہانیوں کی رنگین تصویریں بنانے کا کام ڈھونڈ لیا...... آمدنی تو زیادہ نہیں تھی مگر اس کے پینٹ، برش، مجسمہ سازی کے اوزار اور چھوٹے موٹے اخراجات کا بندوبست ہو جاتا تھا۔

ان دنوں وہ خوش تھی۔

آرٹ کلاس کے لیے بنائی اس کی ایک پینٹنگ اس کے ٹیچر کو اس قدر پسند آئی کہ اس نے اسے ایک تصویری مقابلے میں رکھنے کے لیے لندن کی ایک درمیانے درجے کے آرٹ گیلری میں بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ مقابلے کی تین بہترین پینٹنگز بنانے والوں کو ایک عدد مہنگا اسکالر شپ مل سکتا تھا۔

اپنی ماں کی شادی کے بعد اس کا ہاتھ ہمیشہ تنگ ہی رہا تھا۔ تصویری مقابلے کے لیے اس کی پینٹنگ نے آرٹ کے کسی نقاد کو تو متاثر نہیں کیا لیکن ایک گندمی رنگت والے جنوبی ایشیائی کو وہ پینٹنگ ایسی پسند آئی کہ اس نے مقابلے کے نتیجے کا اعلان ہونے سے پہلے ہی وہ تصویر خریدنے کی پیش کش کر ڈالی۔

اس کی رنگت، اس کی شکل، اس کا حلیہ...... اگرچہ اس نے اپنے باپ کی سنائی ہوئی ہزاروں کہانیوں میں بار بار دیکھا تھا اور ایسے کسی حقیقی کردار سے میگی زندگی میں کبھی ملنے کی آرزومند بھی تھی۔ مگر اپنی محبت کی ایسی سفاک بولی لگتے دیکھ کر اس کا دل مٹھی میں آ گیا۔ تصویری نتائج کا اعلان ہونے اور کامیابی یا ناکامی دونوں صورتوں میں برائے فروخت ہی تھی مگر میگی کو خریدار کا اس قدر سوداگرانہ انداز بالکل پسند نہیں آیا۔

"یہ پینٹنگ برائے فروخت نہیں ہے۔" حتی الامکان تہذیب سے پھینکا ہوا ننھا سا کنکر، ہندوستانی لارڈ شپ کی انا کو بری طرح زخمی کر گیا۔

وہ جس طبقے کا فرد تھا جہاں سے آیا تھا وہاں آرٹ اور آرٹسٹ نامی، کم حیثیت مخلوق کی ذخیرہ اندوزی کر کے اپنے ڈرائنگ روم سجانا ایک بیکار سا مشغلہ تھا۔اس نے پینٹنگ سے نظر ہٹائی اور برابر میں کھڑی انگریز لڑکی کے انتہائی لاتعلق سے لہجے پر غور کیا جو اس کی دلچسپی کے ماخذ سے بے پروا آرٹ گیلری کی جملہ چہل پہل کو زیادہ توجہ سے دیکھتی معلوم ہو رہی تھی۔ بناوٹ کی کسی بیرونی آلائش سے پاک اور تراش خراش سے عاری بالکل خام برطانوی حسن۔

اس نے ایک نظر میں سر سے پاؤں تک لڑکی کا جائزہ لینے کے بعد دوبارہ پینٹنگ کی طرف توجہ کی۔ اب وہ اسے کسی اور نظر سے دیکھ رہا تھا۔

پینٹنگ کا منظر جانا پہچانا تھا۔ وہ ایسے کئی مناظر کا حقیقی طور پر حصہ بھی رہ چکا تھا۔

سیاہ بادلوں کے پیچھے سے برستی بارش کے درمیان سورج مسکرا رہا تھا۔سنہری کرنیں، برستی بارش کے درمیان قدیم عمارتوں والے ایک تنگ بازار پر بے دریغ نچھاور ہو رہی تھیں۔ ساتھ ،ساتھ جڑی تنگ عمارتیں' پرانی طرز کی کھڑکیاں، سودے کے لیے رسی سے باندھ کر لٹکائی ہوئی ٹوکری اور اس کے اوپری سرے پر جھکی لڑکی...... جو زرد لباس میں گہری سبز چُنری کے ساتھ خوشی کی انتہا کو چھوتی منڈیر سے نیچے جھانک رہی تھی۔ نیچے بازار میں خوانچہ فروشوں اور بارش کے پکوان تلنے والوں کا خوش رنگ میلا سجا تھا۔ ڈھول والے، گھوڑے والے، پیدل چلنے والے...... اور تلے ہوئے سنہری پکوان سے اپنا حصہ وصول کرنے کے خواہش مند بچے اور عورتیں کسی نامعلوم جشن کی نوید پر مسکرائے جا رہے تھے۔

منظر اتنا حقیقی اور جاندار تھا کہ ایک لمحے کو اسے لگا وہ پنجاب سے ہو کر واپس آ گیا ہے۔ وہ قسم کھا سکتا تھا کہ اس نے تلے ہوئے پکوان کی خوشبو اپنے نتھنوں میں محسوس کی تھی اور فقیر کے ڈھول کی تھاپ کو پوری جزئیات کے ساتھ سنا تھا۔

وہ دلوں کے بھید جاننے کا دعویدار نہیں تھا۔ ہندوستان کے تقسیم ہو جانے والے پنجاب کا ایک روایتی جاگیردار امیر زادہ تھا۔ جسے ایک لمحے کے لیے لگا تھا، وہ جانتا ہے کہ تصویر بناتے ہوئے آرٹسٹ کے ذہن میں کیا رہا ہوگا۔

اس نے توجہ ایک بار پھر پینٹنگ سے ہٹا کر اسے بنانے والی کی طرف مبذول کی۔ جس کے لاتعلق چہرے پر ایک عجیب سی سرد مہری، ایک عجیب سا چیلنج تھا۔ دوسری نظر اس پر ڈال کر اسے لگا جیسے اس کے سامنے بجی تصویر کے رنگ پھیکے پڑ گئے تھے۔

اب کہ جب وہ بولا تو میگی کی آنکھوں میں چھائی عدم دلچسپی کی دھند ایک لمحے میں غائب ہوگئی۔

''تو آپ کتنی بار انڈیا جا چکی ہیں؟'' وہ پوچھ رہا تھا۔

''ایک بار بھی نہیں۔'' وہ کھلکھلا کر ہنسی تھی۔ ''لیکن مجھے بتایا گیا ہے کہ میں انڈیا میں پیدا ہوئی تھی۔'' جنوبی ایشیائی مرد کے ابرو دلچسپی سے چڑھے۔

''اور کیا آپ کبھی وہاں دوبارہ جانا چاہیں گی؟''

''ضرور...... کبھی نہ کبھی...... مجھے یقین ہے، میں وہاں جاؤں گی۔اور سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھوں گی۔''

''میں اس کا بندوبست کر سکتا ہوں۔ اگر آپ کو یہ عزت مجھے دینے میں کوئی اعتراض نہیں ہو۔''

میگی نے اسے سر سے پاؤں تک دیکھا...... اس کی شکل، اس کا حلیہ' اس کے باپ کی سنائی ہوئی کہانیوں کے انہی کرداروں جیسا تھا جن سے مل کر میگی کا آرٹ پچھلے کئی سالوں سے پنسل سے کھینچی لکیروں اور پینٹ برش کا کھیل بن کر کینوس پر بکھرتا رہا تھا۔

اسے اپنے اچانک عود پڑنے والے غیر ارادی جوش پر حیرت بھی ہوئی مگر بعد میں......

ورنہ اب تک تو میگی کو یہی لگ رہا تھا وہ اسے اپنی تصویر فروخت کرنے پر راضی کرنے کے لیے ایسی زبردست آرٹ شناسی کا دعویدار ہے اور شاید اگر وہ اس خیال میں رہتی تو اس کے حق میں زیادہ بہتر ثابت ہوتا۔

(باقی آئندہ)

پانچواں اور آخری حصہ

کھوئے کھوئے لمحے

تابندہ نعیم

پاکستان کی انتہائی معتبر، انتہائی گہرے جملے لکھنے والی مصنفہ رفعت ناہید سجاد کے انداز تحریر سے متاثر ہو کر شروع کی جانے والی یہ کہانی گزشتہ کئی سالوں سے ٹکڑوں کی شکل میں لکھی جاتی رہی۔ اس عرصے میں پاکستانی معاشرہ تبدیل ہوچکا ہے۔ اب پاکستان کے پبلک پارکس میں شاید ہی کوئی غیر ملکی خاتون پاکستانی طالبات کو شام کی تفریح کرانے نکلتی ہو... مگر ہمارے آپ کے اسی پاکستان میں کبھی ایسا ہوا کرتا تھا۔ کہانی فرضی ہے۔ اس کے واقعات سن انیس سو ستاسی سے انیس سو بچانوے تک کے حالات اور کرداروں پر مبنی ہیں، تاہم ان کی کسی حقیقی کردار یا واقعے سے مماثلت محض اتفاقیہ ہو سکتی ہے۔

موضع محمد خان کے اس اینٹ پتھر کے زندان میں میگی جیسی کئی کہانیاں سایوں کی طرح منڈلا رہی تھیں۔ سائے جن میں روح نہیں ہوتی، رنگ نہیں ہوتے۔ جن کی کوئی تاریخ، ماضی اور مستقبل نہیں ہوتے۔ جو روشنی ہونے پر غائب ہوجاتے ہیں اور اندھیرا ہونے پر دالانوں اور منڈیروں پر چکرانے لگتے ہیں۔

وہ ایک عرصے تک اپنا احتساب کرتی رہی۔ ہر روز، ہر گھڑی، اس سنہری شہزادے کو تلاش کرتی رہی۔ جس کی چمک نے اس کی آنکھیں خیرہ کردی تھیں۔ جس کی بناوٹی خوش ذوقی نے میگی کو اس سنہری سورج کے دیس میں اس کی پسند کے وہ رنگ دکھانے کا وعدہ کیا تھا جسے دیکھنے کے خواب اس کے باپ نے خود اپنی میگی کی آنکھوں میں بھرے

تھے۔ وہ اپنی ماں کی طرح ایک عرصے تک اپنے باپ کو الزام دیتے نہیں تھکی تھی۔

یہاں آکر اسے پتا چلا تھا کہ وہ شہزادے کا بھیس بھرے، دیوزادے کی مٹھی میں آگئی ہے۔ اس کی حیثیت ایک خوش نما تتلی سے زیادہ نہیں...... جس سے دیوزادوں کو بیش قیمت خزانوں کے وہ قفل کھلوانے ہیں جن کی کنجیاں عرصہ ہوا سمندر برد ہو چکی ہیں...... خزانے جن کے پہرے پر ہزاروں سانپ اور بچھو مامور ہیں...... خوش رنگ تتلی کا فرض ہے کہ دیوزادے کو خزانے تک پہنچانے کے لیے اپنے رنگوں سے سانپ اور بچھوؤں کی آنکھیں خیرہ کرے اور خزانے کے قفل کھولنے کا کام اپنے نازک پروں سے انجام دے۔

وہ اپنے باپ کے خواب کی تکمیل ہوتی دیکھ رہی تھی۔

اسی سنہری دیس میں جہاں سانولی سلونی ہندوستانی اپسرائیں حسین ساڑیوں اور رنگین غراروں میں ملبوس، برٹش کلبز میں اپنے قریبی رشتوں کے ساتھ بہار کے رنگ بن کر اترتی تھیں...... جہاں اپنے باپ کی کہانی سناتی آوازوہ اب تک اپنے آس پاس محسوس کر سکتی تھی۔ اب وہ خود اس کہانی کا کردار جو تھی۔ اپنے ساحر کی خوشنودی کے لیے سانولے سلونے چہروں والے کچھ پڑھے لکھے، کچھ ان پڑھ، محفل کے آداب سے واقف اس ملک کے طبقۂ اشرافیہ کی رات گئے برپا ہونے والی محفلوں کا حصہ...... جہاں اس کی ایک مسکراہٹ پر لاکھوں کے سودے کھڑے، کھڑے محمد فیروز معظم خان کے حق میں ہو جاتے تھے۔ اس کا ساحر اپنی مٹھی کھول کر تتلی کو آزاد کرنا بھول گیا تھا۔ میگی نے بعد میں کئی بار سوچا...... شاید تتلی کے رنگ اب بھی اس کی سخت ہتھیلیوں میں کہیں موجود ہوں۔

”کبھی نہ کبھی اس بات کی کھوج بھی کرنی چاہیے......“ اس کے باپ کے خوابوں کے چلچلاتی دھوپ والے اس دیس کا نام ہندوستان نہیں تھا۔

سیاست سے اسے دلچسپی نہیں ہوتی تو بھی اسے جاننے میں زیادہ وقت نہیں لگا کہ دنیا کے اس حصے میں جہاں وہ اپنے دیوزاد کے کاروباری رازوں کی شریک تھی اور جہاں ہر دم سرکاری کنٹریکٹ بڑے، بڑے سرکاری ٹھیکے، تحفے میں لی اور دی جانے والی زمینوں اور نفع بخش سودوں کی باتیں، اس کی زندگی کے خاموش ساز کا پس منظر بن گئی تھیں۔ انسانوں کی ترقی اور اچھے مستقبل کے منصوبے، جنرل، کرنل اور سول بیوروکریسی کے بڑے افسران بناتے تھے۔ غریب اور ان پڑھ عوام کو ایسی باتوں کی سمجھ بوجھ کہاں...... جمہوریت نامی گستاخ چڑیا نے اس اٹھارہ سالہ نوخیز ملک پر ابھی اپنے پر پھیلائے نہیں تھے۔

جس دن شہر لاہور کے باسی ہندوستانی جہازوں کو پتنگوں کی طرح گرتے دیکھنے کے لیے اپنے مکانوں کی چھتوں پر چڑھے ”اللہ اکبر“ کے نعرے لگا رہے تھے۔ اور اس کا شوہر کسی بھی ہنگامی صورتِ حال میں راتوں رات لاہور سے نکلنے کی تیاری کر رہا تھا۔ اس نے لاہور جم خانہ کے لان میں ....۔ گر جانے والے فوجی افسر کو کسی کو پکارتے سنا تھا۔ کوئی مدد کے لیے دوڑا تھا۔

”جنرل آغا...... آر یو آل رائٹ سر؟“ بعد میں اس نے مکار دشمن کے دانت کھٹے ہونے کی خبر فیروز معظم خان کے آبائی گاؤں، موضع محمد خان کی رہائش گاہ پر سنی تھی۔ چند مہینوں بعد ایک بہت بڑی شخصیت جنوبی پنجاب کے دورے پر آئی۔ یہ سنہری موقع تھا اور فیروز معظم خان کی صوبائی سیاست میں بھرپور شرکت کا ٹکٹ بن سکتا تھا۔ فیروز نے اس بار جان نثاری کی حدیں بالکل ہی پھلانگ دیں...... اس رات وہ بڑی شخصیت ...... فیروز معظم خان کی مہمان داری اور اس کی حسین مسکراہٹ والی انگریز بیوی کی سنہری زلفوں کی اسیر بن گئی۔

بعد میں وہ جان گئی کہ وہ شخصیت کون تھی مگر اس سے کیا فرق پڑتا تھا۔ اس کا صیاد، اس کا قاتل، اس کا دلدار، اس کا محبوب...... اسے اس کے بعد کتنی بار اسلام آباد لے کر گیا تھا۔ وہ انگلیوں پر گننے سے قاصر تھی۔

رنگین ساڑیوں اور ریشمی غراروں میں خود کو کسی بلوریں جام کی طرح ہر دم تشنہ رہنے والے لئے نفرت انگیز لبوں کی آسودگی کا بندوبست کرتی اور کسی معمولی حکم عدولی پر دیوزادے کی آنکھ میں لہریں لیتے جلال کو اپنی پیٹھ پر سہتی...... وہ نازک اندام، سروقد، دودھ اور شہد میں گندھی کچھ نہ کچھ پڑھی لکھی،

غیر ملکی عورت...... فیروز معظم خان کے حرم میں داخل اس کی دو خاندانی اور دو غیر خاندانی بیویوں میں سے ایک اس کی جائز اور نکاحی بیوی تھی۔ میگی یعنی مریم فیروز معظم خان......

جوانی کی چاندنی، چودھویں کی رات کی طرح ڈھل گئی......اس کی کوئی اولاد نہیں ہوئی کیوں؟ اس نے کبھی خدا سے شکوہ نہیں کیا...... اسے طلب بھی نہیں تھی۔ بہت سال اسے لگتا رہا کہ خدا نے اسے اولاد نہ دے کر اس کے حصے کی ایک آزمائش کم کر دی ہے۔ عمر بڑھنے کے ساتھ محفلوں میں جان ڈالنے کے لیے اس کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ اتنے سال فرار کی کوشش نہ کرنے کے انعام میں اسے سنگ مرمر کے اس محل میں اس کے حال پر چھوڑ دیا گیا تھا۔

تتلی کے پر ٹوٹ چکے تھے...... ہوا کتنی خوشگوار ہے، پرندے کیسے گنگناتے ہیں، رس بھرے پھول کتنی شوخی سے جھوم رہے ہیں...... مری ہوئی تتلی کو اس سے کیا غرض......؟

فیروز معظم خان کی عمر بڑھی تھی مگر وہ بوڑھا نہیں ہوا تھا۔ ہاں اب اس کے بیٹے جوان تھے...... اب ان کا وقت تھا......اس نے اپنے خوبرو شہزادوں جیسے چار کڑیل بیٹوں کی جوانیوں سے اب وہی کھیل کھیلنا تھا۔ جس کی منصوبہ بندی کبھی اس کے دانا باپ نے اپنے بیٹے کے لیے کی تھی۔ اس کے خاندان کے اثر رسوخ، ترقی اور سربلندی کی ایسی اونچی پرواز کرنی تھی کہ آسمان کی حدیں اس کے لیے تنگ پڑ جائیں۔

''اب تو وقت گزر گیا ہے۔'' اس نے دم بخود بیٹھی سبرینہ کی طرف دیکھ کر مسکرانے کی کوشش کی تھی۔ کھانسی کے ایک شدید دورے سے اس کی سانس اکھڑنے لگی تھی۔

اسے اپنی زندگی سے کوئی خاص شکایت بھی نہیں رہی تھی۔ وہ کہاں سے آئی تھی، اسے کہاں جانا تھا۔ اب یہ سوچنے اور سوچتے رہنے سے کیا حاصل......زیادہ گزر گئی تھی......تھوڑی رہ گئی تھی...... ویسے بھی زندگی میں پچھلے چند سال سے عجیب سا ٹھہراؤ آ گیا تھا...... وہ بیمار رہنے لگی تھی۔ لمبی، لمبی سنسان گرم دوپہریں جن میں بڑھاپا، جنگلی گھاس کی طرح چڑھتا ہوا چلا آرہا تھا۔

سبرینہ ایک ٹک کھانسی کے زبردست دورے سے سنبھلتی ایک چرمرائی ہوئی عورت کے جھریوں بھرے اٹھتے، گرتے پپوٹوں کے پیچھے ماند پڑتی نیلی آنکھوں کے ڈھیلوں ......، پر اترنے والے سفید موتیا کی باریک تہ کے پیچھے ان تیس سالوں کی وہ کہانی پڑھ رہی تھی۔ جسے سنانے والی نے چند جملوں میں سمیٹ لیا تھا مگر جو تین دہائیوں تک، اس کی آتی جاتی سانسوں سے ہو کر گزرتی رہی تھی۔

''افسوس...... مگر کہانی ختم نہیں ہوئی۔'' اس نے صدمے سے سن بیٹھی لڑکی کو تاسف سے دیکھا تھا۔ وہ مسکرائی بھی تھی۔

''میں سمجھتی تھی لڑکیاں اب سمجھدار ہوتی ہوں گی۔ تم نے مجھے بہت غلط ثابت کر دیا۔'' وہ آہستہ سے ہنسی...... ایسی ہنسی جس کا آنکھوں سے کوئی رشتہ نہیں ہوتا۔

''تم اتنے اہم لوگوں سے ملتی رہیں اسلام آباد جا، جا کر تم نے کسی کو ان کی حقیقت نہیں بتائی میگی کسی نے تمہاری مدد نہیں کی......؟ ایسے کیسے؟'' سبرینہ نے پوچھا تھا۔ اور میگی قناعت سے کہہ رہی تھی۔

''میں کسی کو کیا بتاتی؟ وہ میرے کون تھے؟ میرا کون ایسا تھا جس کے پاس میں واپس جانا چاہتی۔ اب تو میں خواب میں بھی اپنے آپ کو اس جگہ کے سوا کہیں اور نہیں دیکھتی۔''

میگی...... میگنا کارٹا یعنی مریم فیروز معظم خان......ان سب حسین ناموں کی بیک وقت مالک......وہ خالی ہاتھ اور خالی دل عورت کب کی اس کے کمرے سے اٹھ کر جا چکی تھی۔

''کون کہتا ہے، تاریخ اپنے آپ کو نہیں دُہراتی۔'' کمرے کے کونے میں رکھی ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے میں اپنا عکس دیکھ کر سبرینہ کو جھرجھری آگئی۔

دو نام......دو چہرے......ایک کہانی۔

ایک فریم میں لگی دو مختلف تصویریں......جس کے رنگ وقت کے ساتھ ایک جیسے بوسیدہ اور پھیکے لگنے لگے ہیں۔

☆☆☆

میگی بیمار تھی...... مگر کتنی بیمار کہ اس دن کے بعد دوبارہ اس کے کمرے تک نہیں آسکی۔

''مریم بی بی کی طبیعت ٹھیک نہیں...... اسے علاج کروانے شہر لے گئے ہیں۔'' اچھی نے اسے بتایا تھا۔

اس سنسان محل کے راز میں سبرینہ کو 'اچھی' ہی آدم زاد لگتی تھی۔ یقیناً وہ جھوٹ نہیں بول رہی تھی۔

''لیکن کیا وہ لوگ جنہوں نے تیس سال میکی کو ایذائیں دی تھیں، اتنے مہربان ہو گئے کہ علاج کروانے اسے شہر لے گئے تھے؟''

سبرینہ کے یہاں لا کر قید کیے جانے پر میکی یعنی مریم کو...... صرف ایک بات سے منع کیا گیا تھا۔ اسے سبرینہ سے دور رہنا ہے۔ میکی کی بغاوت کا سر کچلے انہیں عرصہ ہو گیا تھا۔ مگر سبرینہ کے عزائم اس کی آنکھوں سے جھلکتے تھے۔ وہ بہت پڑھی لکھی تھی۔ اسے جھکانے میں فاروق کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔ کچھ دنوں سے اسے خدشہ پیدا ہو گیا تھا کہ وہ ان کے لیے کوئی بڑا مسئلہ پیدا کر سکتی ہے۔ سبرینہ کو بہت شروع سے معلوم تھا کہ اس کی نگرانی کی جا رہی ہے۔ رات کو اس کے کمرے کی کھڑکی کے نیچے کوئی ہوتا ہے جو مسلسل کمرے کی روشنی جلنے بجھنے کا حساب رکھتا ہے۔ کتنی دفعہ اسے سگریٹ کی بدبو اتنی واضح محسوس ہوئی جیسے کوئی اس کے کمرے کے بالکل نیچے کھڑا ہو کر سگریٹ پیتا ہو۔

اس نے لائٹ بند کر کے کھڑکی سے باہر جھانکنے کی بھی کوشش کی تھی...... گھپ اندھیرے میں جہاں دن کے وقت خوب گھنے مالٹوں کے درخت تھے۔ ایک نہیں سگریٹ کے دو شعلے ابھر کر معدوم ہوئے تھے...... جل کر بجھنے والا شعلہ یہ واضح کرنے کے لیے کافی تھا کہ کون سے اور کتنے پہرے دار صرف اس کی ڈیوٹی پر تھے۔

گرمی کی اس مختصر رات میں، اپنے گھروں کا آرام چھوڑ کر وہ اس مالک کی وفاداری کا دم بھر رہے تھے۔ جس کی زمین سے ان کے ادھ کچے مکانوں میں سال بھر کا گندم اترتا تھا۔

''کیا ان کے کوئی گھر، کوئی گھر والے نہیں ہیں۔''

''کیا ایک عورت پر پہرہ بٹھانے کے لیے اتنے سارے مضبوط ڈیل ڈول والے مرد درکار ہوتے ہیں؟''

''کیا وہ ان میں سے کسی ایک کا بھی کچھ بگاڑ کر کہیں جا سکتی ہے؟''

''کیا وہ کبھی یہاں سے بھاگ سکتی ہے؟''

آج تک سبرینہ اپنے ساتھ ہوئی زیادتی کو اپنے باپ کی نافرمانی کی سزا سمجھتی آئی تھی لیکن اب نہیں...... میکی سے ملاقات نے اسے جتنا ششدر کیا تھا اتنا ہی اس کی پُراسرار گمشدگی اسے خوفزدہ کر رہی تھی۔ اس نے حساب لگایا، میکی کو دیکھے اسے دو ہفتے ہونے والے تھے۔ وہ اس کی کہانی کے ہر حصے پر، ہر پہلو پر غور نہ کر رہی ہوتی تو بھی اس سے ایک بار تو اور ضرور ملنا چاہتی تھی۔

سنسان دوپہر میں چلچلاتی دھوپ سمیٹتے آم کے درختوں کے نیچے گھاس لمبی ہو رہی تھی۔ بلیڈ جیسی نوکیلی گھاس سے بھاپ کی طرح بلند ہوتی حبس اور خاموشی کی آواز کان کے پردے پھاڑنے کے لیے کافی تھی۔ اس کی کھلی کھڑکی سے نظر آتا گہرا نیلا آسمان دور تک بادلوں سے مایوس تھا۔

وہ میکی کا رستہ دیکھتے، دیکھتے تھکنے لگی تھی کہ 'اچھی' کی لائی ہوئی خبر نے اسے بالکل ہی دل برداشتہ کر دیا۔

''مریم بی بی اتنی بیمار تھی کہ ڈاکٹروں نے جواب دے دیا۔''

''وہ کس اسپتال میں داخل ہے؟ وہ کس شہر میں موجود ہے؟''

'اچھی' کے پاس ایسے سوالوں کا کوئی جواب نہیں تھا۔

اس رات وہ سو نہیں سکی۔

وہ میکی کے لیے کیا کر سکتی تھی؟ وہ اپنے لیے کیا کر سکتی تھی؟ تو کیا وہ مان لے کہ وہ ہار گئی ہے؟

تو کیا وہ اپنی موت سے پہلے ہو جانے والی اس موت کو خدا کا حکم سمجھ لے؟ موت جو ہر سانس لینے والے وجود کو تب آتی ہے جب دنیا میں اس کا کام ختم ہو گیا ہو۔ تو کیا اس محل میں رہنے والے، اس کے پیدا کرنے والے سے پہلے اس کی زندگی ختم کر سکتے ہیں؟ شاید ہاں...... شاید نہیں......

☆☆☆

اگلے دن بہت ہی غیر متوقع طور پر فاروق آ گیا...... نہ صرف گھر آیا بلکہ کمرے میں بھی آیا۔

وہ لنگڑا کر چل رہا تھا...... ریس کلب میں گھڑ دوڑ جیتنے کے بعد اس کی سب سے اعلیٰ نسل کی عربی گھوڑی نے اسے اپنی پیٹھ سے پٹخ دیا تھا۔ فاروق منہ کے بل گرا تھا۔ اس کے گھٹنے اور کہنیاں بری طرح چھل گئی تھیں۔ سبرینہ کو حیرت اس پر نہیں ہوئی کہ گھوڑی سے گرنے والا فاروق تھا۔ اسے حیرت

اس پر ہوئی کہ فاروق نے اسے ساری کہانی سنا کیسے دی۔ شاید چوٹیں انسان کو انسان کے ساتھ انسانوں کی طرح پیش آنا سکھا دیتی ہیں۔ عارضی طور پر ہی سہی...... اب وہ اس کہانی کے بدلے اس سے نہ جانے کس چیز کی توقع کر رہا تھا۔

فاروق بہت دنوں بعد اس دن اس کمرے میں جس سبرینہ سے ملا وہ وہی لڑکی تھی، جس کے گرد اس نے پاکستان آنے سے پہلے پروانوں کی طرح طواف کیا تھا۔

ہمدرد اور دل کو چھو لینے والی مسکراہٹ سے دمکتی سبرینہ گیبرئیل کی آنکھوں میں ستارے تھے، وہی ستارے وہی نرمی، وہی مہربان آنکھیں...... جنھوں نے کبھی ایڈنبرا میں اسے ایک اچانک فیصلہ کرنے پر مجبور کیا تھا...... جب اسے لگا تھا کہ اس وننگ ٹرافی کو جیتے بغیر وہاں سے چلا آیا تو ساری زندگی نقصان میں رہے گا۔

آج وہ اپنی مہکتی لٹیں، کانوں کے پیچھے اڑسے.... فکرمندی سے مسکراتی اے سی کی ٹھنڈی گدگداتی ہوا کے نیچے اس کے بازو پر جھکی تھی۔ اس کی زخمی کہنی پر چڑھی موٹی پٹی کی تہ پر محبت سے اپنا ہاتھ پھیر رہی تھی۔ فاروق کو ایڈنبرا کے کرکٹ گراؤنڈ کا وہ منظر یاد آ گیا۔ جب وہ اسے پہلی بار ملی تھی...... اور ڈراپ ہوجانے والے کیچ کے پیچھے گھٹنا چھلوانے والے فیلڈر سے پوچھ رہی تھی۔

''تمہیں کہیں چوٹ تو نہیں آئی؟'' اس رات سونے سے پہلے فاروق نے عرصے بعد سبرینہ کے لیے اپنے دل میں پشیمانی کی ایک زبردست لہر اٹھتی ہوئی محسوس کی۔ کیا کر دیا تھا اس نے اس زبردست لڑکی کے ساتھ۔ وہ اس کی زندگی میں، اس کی مرضی سے شامل ہوئی تھی اور اتنا ساحق تو رکھتی تھی کہ اسے انسان سمجھ کر پیش آیا جاتا شاید اس طرح اس سے کبھی، کبھی اپنی بات منوانا آسان ہو...... اور بات بھی کون سی......؟ یہی ناں کہ اس کے باپ کے ملتان اور اسلام آباد والے محل کی دعوتوں میں بڑے ناموں اور بڑی پارٹی کی سیاست کرنے والی اہم شخصیات سے اچھی میزبان کی طرح پیش آنے کے 'ضروری آداب' بجالاتا۔

اس نے اپنے سینے پہ دھرے گہرے براؤن بالوں والے ریشمی مہکتے سر کو چھو کر ایک طمانیت بھرے سکھ کی سانس لی...... اس کے باپ نے اسے یقین دلا دیا تھا کہ وہ اتھری گھوڑی جیسی لڑکی اس کے خاندان کے کسی کام نہیں آسکے گی لیکن گہری نیند میں جاتے اس کے دماغ میں ایک خیال سما چکا تھا۔ وہ سبرینہ کو اپنے ساتھ اسلام آباد لے جائے گا۔

خواب میں اس نے خود کو سبرینہ کے ساتھ ایک پھولوں بھرے راستے پر، ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے چلتے ہوئے پایا۔ جہاں درختوں کے پتے ڈوبتے سورج کی گہری لال روشنی میں سرخ رو نظر آ رہے تھے۔ سبرینہ ہنس رہی تھی۔ پھولوں بھرا جنگل اس کی نقرئی ہنسی سے مسکرا رہا تھا۔

اگلی صبح اس کے تمام نیک ارادوں کو ملیا میٹ کرتی ہوئی آئی تھی...... وہ غصے سے پاگل ہوا اٹھا تھا...... سبرینہ گیبرئیل اس کے محل کی آسمان تک بلند دیوار کے بیچ کہیں معدوم ہوگئی تھی۔

اس کے ہرکارے شکاری کتوں کی طرح علاقے سے باہر جانے والے راستے پر ملتان، خانیوال، لاہور، جی ٹی روڈ پر علاقے کے چھوٹے سے ٹرین اسٹیشن پر اس کی بیوی کی بو سونگھتے پھر رہے تھے جو اُن کے مالک کی غفلت کا فائدہ اٹھا کر جیسے صفحۂ ہستی سے غائب ہوگئی تھی۔ ایسا غضب اس محل کی تاریخ میں پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ وہ اس گھٹیا عورت کو اپنے بھوکے کتوں کے آگے ڈلوا سکتا تھا...... اس کو تیزاب میں نہلا سکتا تھا۔ اس کے ٹکڑے، ٹکڑے کر سکتا تھا۔ وہ چوٹ کھایا ہوا سانپ تھا...... جو صبح کی خوشگوار ہوا میں بدمست ہوگیا تھا۔

میگی کے غائب ہونے کے بعد سبرینہ نے جب اپنا انتہائی ضروری سامان اکٹھا کرنا شروع کیا تھا...... تو وہ نہیں جانتی تھی کہ وہ جو کرنے کا موہوم ارادہ کر رہی ہے اسے پورا کرنا کیونکر ممکن ہوگا...... کبھی، کبھی انسان اپنے آپ کو بھی حیران کر دیتا ہے ناں......

کس زبردست قوتِ ارادی کے ساتھ اس نے اپنے چہرے پر اس پرانی سبرینہ کا ماسک چڑھایا تھا۔ کوئی اس سے پوچھتا تو وہ کوئی جواب نہیں دے پاتی۔

مگر کہانی ختم نہیں ہوئی تھی۔ کم از کم اس کی کہانی ابھی ختم نہیں ہوئی تھی۔

☆☆☆

اس شام جب فاروق آیا تو وہ فیصلہ کر چکی تھی۔ اس کے سامنے دو ہی راستے ہیں۔ ساری عمر یہیں مرتے رہنے کا...... یا آزادی کی ایک آخری کوشش کے ساتھ مرنے کا راستہ...... اس نے دوسرا راستہ پسند کیا تھا...... مگر جس میں آزادی کی ایک موہوم سی امید بھی تھی۔

فاروق گہری نیند میں تھا...... سبرینہ اپنے نیند میں جاتے دماغ کو شدید قوتِ ارادی سے جگائے رکھنے کی کوشش کررہی تھی۔ اسے ڈر بھی لگ رہا تھا کہ وہ کیا کرنے جارہی ہے۔ کتنے دنوں بعد وہ یوں ایک ساتھ تھے۔ جھوٹ ہی سہی مگر کیا ہوا جو اس خواب کی عمر لمبی ہوجائے۔

مگر اس کے اندر کوئی اسے لمحوں کے طلسم سے بچنے اور جاگتے رہنے پر اصرار کررہا تھا۔ وہ بے آواز اتری، ڈریسنگ روم کے کھلے دروازے سے ایک چھوٹا سا بیگ اٹھایا اور کمرے کا دروازہ بے آواز دھکیلتے پیچھے مڑ کر دیکھا، اسے اپنے دل کی دھڑکن صاف سنائی دے رہی تھی۔

اس نے فرار کے لیے وقت کا انتخاب بہت سوچ سمجھ کر نہیں کیا تھا پھر بھی جب وہ کچن کے پچھلے دروازے کی چٹخنی کسی مشکل کے بغیر بے آواز کھولنے میں کامیاب ہوئی تو پہرے پر مامور محل کے ملازم فجر کی نماز ادا کرنے رہائشی عمارت کے پیچھے کچھ فاصلے پر الگ تھلگ احاطے میں بنائی گئی...... ایک کمرے کی چھوٹی سی مسجد کا رخ کرچکے تھے۔

مسجد نے کبھی لاؤڈ اسپیکر کا منہ نہیں دیکھا تھا مگر موذن کی اذان اسے تب بھی بغیر اسپیکر کے سنائی دیتی تھی۔ جب وہ پوری رات سو نہیں پاتی تھی۔ جب اس قید سے نکلنے کا منصوبہ بنانے کی جرأت کبھی بھولے سے بھی اس کے قریب نہیں پھٹکی تھی۔ ہاں اپنا بچہ کھونے کے بعد کی رات اس نے مسجد سے اٹھتی اذان کی ضعیف آواز پر گڑگڑا کر اپنے لیے آزادی کی دعا ضرور مانگی تھی۔

وہ بڑی سی سیاہ چادر میں سر سے پاؤں تک چھپی، درختوں اور پودوں کی آڑ میں چھپتی چھپاتی گارڈز کے کمرے تک پہنچ گئی تھی۔ اور یہ دیکھ کر اس کا دل بلیوں اچھلنے لگا تھا کہ آسمان تک بلند گیٹ میں پیدل آنے جانے والوں کے لیے بنا لوہے کا چھوٹا دروازہ قدرے کھلا ہوا تھا۔ بندوق بردار گارڈز کی کوٹھڑی کی کھڑکی سے روشنی باہر آرہی تھی مگر اندر کوئی نہیں تھا۔ وہ پودوں کی آڑ لیتی، قدرے جھکی جھکی آگے بڑھی۔ اس نے پیچھے مڑ کر ایک دفعہ گارڈز کے کمرے کے دروازے کو پھر دیکھا وہ کھلا ہوا تھا۔ مگر کمرے کے اندر کسی کے موجود نہ ہونے کا یقین ہونے پر اس نے بجلی کی سی تیزی سے گیٹ کی جھری کشادہ کرکے باہر پاؤں نکالا تھا۔

اتنی ہی تیزی سے اس کا دل اچھلا تھا جب اس نے اپنے پیچھے ایک محافظ کتے کو زور، زور سے بھونکتے سنا...... اسے لگا اس نے کچھ بھاگتے قدموں کی آوازسنی ہے۔ کوئی باہر کی طرف آرہا تھا...... وہ بھاگنا نہیں چاہتی تھی مگر اس کے پاس سر پر پاؤں رکھ کر بھاگنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا...... وہ سامنے کے رخ بھاگنے کے بجائے اس رخ دوڑنے لگی جہاں گھنے درختوں کی باعث ابھی مکمل اندھیرا تھا۔ بغیر سمت کا تعین کیے وہ اندھا دھند بھاگ رہی تھی، کتنی دور جا کر اسے احساس ہوا اس کے پیچھے کسی تعاقب کا نشان نہیں ہے۔ رات کا سینہ چیر کر صبح کا اجالا ہلکے، ہلکے پھیل رہا تھا۔ روشنی پھیلتے دیکھ کر اسے شدید گھبراہٹ نے آلیا۔

وہ قدرے آرام سے چلنا چاہتی تھی مگر جلد از جلد کسی ایسی جگہ پہنچنے کا خیال جو اسے فاروق کے کارندوں سے بچالے...... اسے اپنی رفتار آہستہ نہیں کرنے دے رہا تھا...... وہ صرف اندازے کے بل پر اس سمت میں چل رہی تھی جہاں اس کے خیال میں بڑی سڑک نہیں ہوسکتی تھی۔ اس کے پاؤں میں خوب گھسے ہوئے پرانے کھسے تھے جو اس نے صفائی کرتی 'موچھی' کی نظر بچا کر غائب کیے تھے۔ ایک جوگرز کا جوڑا، اس کے مختصر سے بیگ میں تھا تو سہی مگر اسے پہن کر شاید کوئی اسے ایک پردہ دار، ضرورت مند، مقامی عورت نہ سمجھتا...... وہ کھیتوں کی پگڈنڈیوں سے گزرتی، نماز پڑھ کر آتے، پانی کی باری کھولتے کسی نامعلوم منزل کا رخ کرتے کسانوں کی نظروں سے بچتی بچاتی تیز قدموں سے چلتی رہی...... چلتی رہی...... اس کی سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی۔ پسینہ سر سے پاؤں تک بہہ رہا تھا۔

ستمبر کا مہینہ ختم ہورہا تھا۔ کھیتوں میں طلوع ہوتی صبح کی نرم ہوا خوشگوار تھی۔ ایک درخت کی اوٹ میں رک کر اس

نے سانس ہموار کرنے کی کوشش میں دیکھا...... وہ ایک تنگ سی مٹی کی سڑک کے قریب تھی۔ دور کہیں سے سنائی دینے والی مقامی موسیقی کی آواز قریب آتی محسوس ہو رہی تھی۔ اس کا پہلا ردِعمل چھپنے رہنے کا تھا مگر وہ جانتی تھی وہ سارا دن بھی چلتی رہے تو کسی ایسی آبادی تک نہیں پہنچ سکتی جہاں فاروق کے کتے اس کی بُو نہ سونگھ سکیں۔

تیز آواز میں ٹیپ ریکارڈ سے بجائی جانے والی وہ کوئی مقامی موسیقی تھی جو ایک بڑی سی لدی پھندی ٹریکٹر ٹرالی سے بلند ہو رہی تھی۔ ٹرالی قریب آ رہی تھی اس نے حسرت سے اس شاہانہ سواری کو دیکھا۔ جس کے شاندار جثے کو چار نہیں آٹھ پہیے لگے تھے۔ گھریلو استعمال کا سامان، چند رنگین، نئی اور پرانی چارپائیاں، زنگ آلود ٹرنک، کچھ برتن، کچھ بستر بند، چند عورتیں بہت سے بچے...... انہیں سامنے سے گزرتے دیکھ کر اسے اپنے شدید خطرے میں گھرے ہونے کا احساس ہوا...... اس دھول اڑاتی طویل انجان سڑک پر وہ کس قدر غیر محفوظ تھی...... شاید اس کی عقل کبھی اس کا ٹھیک، ٹھیک اندازہ نہ لگا سکتی...... اگر آج اس سڑک پر فاروق کے کارندے اس کی لاش گرا دیں تو ایسی ٹرالیوں کے نیچے روندنے میں انہیں ایک لمحے کا تامل نہیں ہوگا۔ وہ اسے ٹریکٹر کے پہیوں میں لپیٹ کر شہر بھر میں گھسیٹے پھریں گے۔ ویسے ہی جیسے فاروق نے اس کی آنکھوں کے سامنے کسی اور کے ساتھ کیا تھا۔

اسے پتا نہیں لگا مگر بے اختیار۔ ہی وہ درخت کی اوٹ سے نکل کر سڑک کے کنارے آ گئی۔ ٹرالی کے لدے پھندے چھن چھن کرتے، ایکسلریٹر کے پیچھے سے نظر آتے کچھ شرارت پر آمادہ ننگے بچوں کو دیکھ کر اس نے ہاتھ اٹھایا تھا...... رکنے کا اشارہ کیا تھا۔

اسے احساس ہوا کہ ٹریکٹر ٹرالی کچھ فاصلے پر جا کے رک گئی تھی۔ ٹریکٹر سے بلند ہونے والا مقامی میوزک بدستور جاری تھا...... ٹرالی کے بیچوں بیچ کھڑے بچے، شور مچا کر اور ہاتھوں کے اشاروں سے اسے ٹرالی پر سوار ہونے کی پیشکش کر رہے تھے۔ حلیے سے مزدور لگنے والا ایک مرد ٹریکٹر سے نیچے اترا...... غالباً بچوں کا باپ اس نے کسی تجسس کے بغیر سڑک کے کنارے لفٹ مانگنے والی پردہ دار زنانی کو جس نے اپنا سارا چہرہ چادر کے نقاب میں چھپا رکھا تھا اپنی شرائط بتانا مناسب سمجھیں۔ وہ 'اچھی' کے جیسی مقامی زبان ہی بول رہا تھا۔ پھر بھی وہ صرف اتنا ہی اندازہ لگا سکی کہ وہ اسے زیادہ دور تک نہیں چھوڑ سکتے۔ انہیں قریب ہی کسی گاؤں پہنچنا تھا۔

وہ ٹریکٹر کے پچھلے پہیے پر پاؤں رکھ کر ٹرالی کے اندر کودی تھی تو اس میں اتنی ہی جگہ تھی کہ ایک مختصر سا وجود سکڑ سمٹ کر بیٹھ سکے۔ ٹریکٹر اس کے بیٹھنے سے پہلے حرکت میں آ چکا تھا۔ اس نے چادر کا پلو مزید چہرے پر کھینچتے ہوئے بھی ایک نظر اٹھا کر اپنے پیچھے رہ جانے والی دھول اڑاتی سڑک کو دور تک دیکھا تھا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ فاروق...... نہ اس کے کارندے...... صبح کا سورج پیلی ٹکڑیوں جیسی دھوپ ترتیب سے بنے ہوئے کھیتوں کے سبزے پر بکھیر رہا تھا۔

اس نے ٹرالی میں بیٹھی دو مقامی عورتوں سے آنکھ ملانے کی کوشش نہیں کی۔ ٹریکٹر کے ہڈ سے اب کسی علاقائی گلوکارہ کا شوخ سا نغمہ بلند ہو رہا تھا۔ وہ ٹرالی کے پیچھے جوش دلاتی دھن پر حرکت کرتے، ناچتے اور ادھ ننگے بچوں سے آنکھ ملاتے بھی ہچکچا رہی تھی۔ اس کی آنکھوں کا رنگ ان کی آنکھوں جیسا نہیں تھا۔ وہ ان میں سے نہیں ہے، یہ راز کھولنے میں کوئی عقلمندی نہیں تھی۔ وہ سر نیہوڑائے کتنی دیر ٹریکٹر کی ٹیک سے لگی دھول مٹی سے اٹی سڑک کے ہچکولے کھاتی رہی تھی۔ معلوم نہیں کیا ہوا...... ٹریکٹر رک گیا تھا...... ٹرالی کی بیرونی دیوار پر کسی چیز کی ضرب لگا کر اجنبی زنانہ سواری کو اترنے کے لیے کہا جا رہا تھا۔ انہوں نے اسے اس کی منزل تک پہنچانے کا وعدہ تو کیا بھی نہیں تھا۔ اس نے مٹھی میں دبا ایک نوٹ ٹرالی کے فرش پر بے تکلفی سے بکھری، بچوں کی کم عمر ماں کی طرف کھسکایا اور اتر گئی۔

اس کے اترتے ہی ٹریکٹر دوبارہ چل پڑا تھا اور اس سے وہی مقامی دھن بلند ہو رہی تھی جو یہاں تک آتے، آتے پتا نہیں کتنی بار بجائی گئی تھی۔ وہ زبان اور الفاظ سمجھنے سے قاصر تھی مگر خوش کن موسیقی کی مانوسیت کا لطف تو لے سکتی تھی۔ زندگی کو اگرچہ اس کا ایسے مانوس راستوں پر چلنا پسند نہیں آیا مگر کتنی حیرت کی بات تھی کہ اس نے نامعلوم کے

خوف سے اپنے اندر اسی زندان میں واپسی کی خواہش سر اٹھاتی محسوس کی۔ جس سے فرار کا راستہ اس نے آج اپنی جان پر کھیل کر تلاش کیا تھا۔

☆☆☆

وہ کسی چھوٹے سے قصبے کا بس اڈہ تھا۔

کالی کھجوروں اور جاتے موسم کے پیلے آموں کی بہار دکھاتی اکا دکا ریڑھیوں پر مکھیوں کی دعوتِ عام جاری تھی۔ اخبار رسالے بیچنے والے راستے میں ستانے کو رکتی بسوں کے شیشوں کے پاس آواز لگا رہے تھے۔ غالباً آج کوئی بڑا واقعہ ہوا تھا اور اگر نہیں بھی ہوا تو آج ایک کمزور لڑکی اپنے دیوزادے کے منہ پر تھوک کر آزادی کی خواہش میں اندھا دھند گھر سے بھاگی تھی۔

ابھی صبح کے دس نہیں بجے تھے لیکن تیز سورج کی روشنی اس کی آنکھوں کو خیرہ کیے دے رہی تھی۔ اسے یاد نہیں تھا اس نے آخری بار کب اتنی دیر اتنی روشنی کو قریب سے دیکھا تھا۔

بس اڈے کے کنارے بنے چھوٹے سے ہوٹل پر چائے دم ہونے کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ ہوٹل کے باہر دو بچے اپنے سے بڑے سائز کے دیگچے لیے ان کے پیندے مانجھ رہے تھے۔ ہوٹل کے باہر گاہکوں کے لیے بچھی بینچوں کے پاس پانی کا تازہ چھڑکاؤ کیا گیا تھا۔ ایک نظر میں اردگرد کا جائزہ لینے پر اسے یہ اندازہ لگانے میں دقت نہیں ہوئی کہ دنیا کے اس حصے میں کسی اکیلی عورت کا کسی بس اڈے پر کسی بھی وقت تنہا موجود ہونا، کوئی معمول کی بات نہیں ہے۔

اسے لگا اڈے پر موجود ہر ذی روح جانتا ہے کہ وہ فاروق کی گھر سے بھاگ نکلنے والی وہی بیوی ہے جسے پکڑ کر کتوں کے آگے ڈالنا انسانیت کو اپنا فرضِ عین سمجھنا چاہیے...... وہ بھوک پیاس سے بے نیاز کسی بھی آتی جاتی بس میں سوار ہوسکتی تھی مگر بسوں کی ونڈ اسکرین پر اردو میں لکھی منزل کی تختیاں پڑھنا ابھی اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ پھر بھی وہ جس مسافر خاندان کی دو برقع پوش عورتوں کے پیچھے اڈے سے نکلنے والی اگلی بس میں سوار ہوئی تھی اسے لاہور جانا تھا۔ یہ سبرینہ نے اس خاندان کے واحد مرد کے منہ سے تین بار لاہور سن کر اندازہ لگایا۔

اس کی منزل اسلام آباد ہونی چاہیے تھی۔ اسے برطانوی ہائی کمیشن سے مدد طلب کرنی تھی لیکن اتنا اندازہ لگانا فاروق کے لیے ذرا مشکل نہ ہوتا کہ وہ نکل بھاگنے میں کامیاب ہوئی تو سب سے پہلے کہاں کا رخ کرے گی...

فی الحال اس کا فاروق کے شہر سے دور جانا ضروری تھا۔ اس کے پاس رقم محدود تھی۔ اور کتنی عجیب بات ہے کہ وہ جب سے اس ملک میں آئی تھی، اس نے یہاں کی کرنسی کبھی ہاتھ میں پکڑ کر نہیں دیکھی تھی۔ پھر بھی فرار کا موہوم خاکہ اپنے ذہن میں واضح ہوتا دیکھ کر اس نے اپنی الماری میں لٹکے فاروق کے کپڑوں کی تلاشی لی تھی۔ اس کے کوٹ کی جیب سے کچھ نوٹ نکالے تھے جو بہت زیادہ نہیں تھے اور کتنی عجیب بات ہے کہ پیسہ اہم نہ ہو تب بھی پیسے کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

بس کے کرائے کے پیسے دے کر چند ہی نوٹ باقی بچے تھے۔ اس نے دیکھا اس کی مٹھی میں دبے چرمرائے نوٹ پر ایک کا ہندسہ اور دو زیرو لگے تھے۔ درمیان میں شفیق صورت، سنجیدہ آنکھوں والے بزرگ قائداعظم کی تصویر تھی جن کے بارے میں فاروق نے اسے شروع دنوں میں ایک بار بتایا تھا کہ وہ بس پاکستان بنانے کے سزاوار تھے...... ملک تو اس جیسے بیرون ملک سے تعلیم یافتہ، ایلیٹ اور دولت مند خاندانوں نے بعد میں بنایا...... اس نے اپنے ساتھ تقریباً جڑ کر بیٹھی، بار بار سیدھے ہاتھ کو بلند کرتی، چہرہ اوپر کر کے دونوں آنکھوں کی پتلیوں میں کوئی آئی ڈراپس ٹپکاتی پسینے میں تربتر بزرگ خاتون کے دونوں ہاتھوں کی اوٹ سے نظر آتے ہرے بھرے پاکستان کو دیکھا۔ جس کے کس حصے میں اسے جان کی امان ملے گی...... یہ ابھی طے ہونا باقی تھا۔

☆☆☆

وہ لاہور اتر تو گئی تھی لیکن انسانوں کے ہجوم اور فراٹے بھرتی ویگنوں سے اٹے بادامی باغ کے بس اڈے سے ادھر تیزی سے نیچے جاتا سورج اس کے سامنے خوف سے بھرے کئی سوال پیدا کر رہا تھا۔ وہ یہاں تک پہنچ سکے گی یا نہیں...... آج صبح منہ اندھیرے فاروق کو سوتا پا کر فرار کی راہ اختیار کرتے اس نے ایک بار بھی نہیں سوچا تھا لیکن اب تیز رفتار ویگنوں اور بسوں کی چھتوں پر بیٹھی ملازمت پیشہ

سواریوں کو اپنے، اپنے نواحی شہروں کی طرف روانہ ہوتے دیکھ کر اسے پہلی بار احساس ہوا تھا کہ دن کی روشنی کو رات میں بدلنے میں وقت نہیں لگے گا۔

''کیا وہ سڑک کے کنارے، کھڑے، کھڑے ساری رات گزار سکتی ہے؟'' اسے یاد نہیں...... اس نے آخری بار کھانا کب کھایا تھا۔ کل رات یا شاید کل صبح...... انسان آخر کتنے گھنٹے بھوکا رہ سکتا ہے؟ کیا جان کا خوف انسان کو کئی دن بھوکا رہنے اور زندہ رہنے کی طاقت دے دیتا ہے؟

گرمی اور حبس سے بھرا لاہور جس میں چہرے پر کھینچی سیاہ چادر پسینے کر منہ کے ساتھ چپکی جا رہی تھی۔ شاید وہ ابھی مزید سوچنے میں کچھ وقت ضائع کرتی اگر اس کے سامنے سواریاں اتارتا رکشے والا کالی چادر والی زنانہ سواری کی طرف منہ کر کے چلایا نہ ہوتا۔

''فاطمہ جناح ...... ٹیمپل روڈ...... مزنگ روڈ...... برٹش کونسل......'' جتنی دیر میں رکشا والا کسی اور زنانہ سواری کو گھیر کر منزل پر پہنچانے کا لالچ دیتا، وہ رکشے میں بیٹھ چکی تھی۔ اس شہر میں کوئی برٹش کونسل بھی ہوگا...... وہ بالکل آگاہ نہیں تھی۔ لیکن اگر ایسا کوئی ادارہ ہے تو اسے وہاں مدد ضرور مل سکتی ہے۔ مگر بادامی باغ سے برٹش کونسل پہنچنے کے راستے میں اس نے جتنے بھی ارادے کیے تھے ان پر رکشے والے کو اس کی منہ مانگی ادائیگی کرنے کے ساتھ ہی اوس پڑ گئی۔

سرخ اینٹوں اور سرمئی سیمنٹ سے بنی عمارت کے مین گیٹ کو ایک چوکس اسلحہ بردار گارڈ نے باہر سے تالا لگا رکھا تھا۔ وہ پیدل آنے جانے والوں کے لیے بنے چھوٹے گیٹ کو بھی اپنے آہنی ارادوں سے روکے کھڑا تھا۔

سبرینہ کی محنت سے بولی گئی اردو، زبردست انگلش اور خستہ حالت بھی سیکیورٹی گارڈ کو قائل کرنے کے لیے کافی نہیں تھی کہ اس کا کونسل کی کسی ذمے دار شخصیت سے ملنا کتنا ضروری ہے۔ وہ دفتر کا ٹائم ختم ہونے کے بعد کسی کو اندر جانے کی اجازت نہیں دے سکتا تھا اسے یہی حکم تھا۔

اسے بھوک، پیاس اور گرمی سے چکر آ رہے تھے۔ برٹش کونسل کی مین لائبریری بند ہو چکی تھی۔ وہاں کام کرنے والے معلوم نہیں کہاں تھے۔ مگر وہ آہستہ، آہستہ قدموں سے پیدل چل کر باہر نکلتی سیدھی مانگ، گہری رنگت اور سوتی شلوار قمیص والی خاتون تھیں۔ جنہوں نے سبرینہ اور گارڈ کے مابین جاری بے نتیجہ بحث کا نوٹس لیا تھا۔ انہوں نے سبرینہ کے قریب آ کر انگلش میں مشورہ دیا تھا۔

''بی بی تم اب پیر کو آنا...... برٹش کونسل اتوار کو بند رہتی ہے۔'' سبرینہ کا دل ڈوب گیا۔ اس کے فرشتوں کو بھی یاد نہیں تھا کہ کام کی جگہوں کے اوقات کار اور آرام کے دن مخصوص ہوتے ہیں۔ اگر ایک بار بھی اس نے مہذب دنیا کے کام کے دنوں پر غور کیا ہوتا تو ایسی فاش غلطی کیا کبھی ہوتی؟

اور اب کیا کرے وہ؟ خاتون نے ماتھے تک کھینچی چادر کو ایک ہاتھ سے مضبوطی سے دبوچے کھڑی، چہرے کا مکمل پردہ کیے لڑکی کی بے تحاشا تھکی ہوئی، سنہری اور سبز آنکھوں کو شدید مایوسی سے دوچار ہوتے دیکھا۔

کیا اس کی پلکوں کے پیچھے نظر آنے والی پتلیاں اتنی ہی خوفزدہ تھیں جتنی مس وکٹوریہ ڈیوڈ کو اس روز محسوس ہوئیں؟ شاید انہوں نے اس پر بعد میں بھی غور کیا ہو لیکن اس روز کا سب سے ناقابلِ فراموش واقعہ یہ تھا کہ گرے بالوں کے ننھے سے جوڑے والی مس وکٹوریہ نے اس شام سبرینہ گیبرئیل فاروق فیروز خان کو سخت مصیبت کی ماری انسان جان کر اپنی چھت کے نیچے پناہ دینے کی پیش کش کر دی تھی۔

☆☆☆

13 دسمبر 1990ء

''کبھی کبھی ہم اپنے خدا سے کتنے مایوس ہو جاتے ہیں ناں......'' سبرینہ نے کوئی اٹھائیس کروڑ مرتبہ کی سوچی ہوئی بات ایک بار پھر دھیان سے سوچنے کی کوشش کی۔

''سردی کتنی بڑھ گئی ہے، تم اتنے ہلکے سوئٹر میں بیٹھی ہو سبرینہ......'' انہوں نے قدیم آتش دان کی طرف رخ کیے بیٹھی خود سے الجھتی لڑکی سے کہا جو نہایت توجہ سے اونچی چھت والے قدیم ہاسٹل کے ٹھنڈے یخ کمرے کو گرم رکھنے میں ناکام ہیٹر کی سرخی پر غور کر رہی تھی۔

اس نے ان کی سرزنش سنی اور رخ موڑ لیا۔

''بس یہ مہینہ ہی ہے سخت سردی کا۔'' انہوں نے اسے متوجہ دیکھ کر تیزی سے اون سلائیاں چلاتے کہا۔

''اتنی سخت دھند پہلے کبھی ہوتی تو نہیں یہاں۔''
سبرینہ نے کھڑکی کے شیشوں کے باہر نظر ڈالی......
لاہور سفید دھند کی بکل مارے، خاموشی کی دبیز تہ میں لپٹا، کھڑکی کے شیشوں کے باہر بکھرا ہوا تھا۔
''اچھا؟'' وہ مسکرا دی...... پتا نہیں ایسی کتنی طویل کہرے بھری اداس چھٹیاں انہوں نے اسی آتش دان کے سامنے سوئٹر بُن، بُن کر گزاری تھیں۔
وہ کس کے لیے بُنتی تھیں...... اور کیوں؟ ان کا کوئی رشتے دار تو یہاں تھا نہیں یا شاید ہو بھی...... وہ کالج میس کی انچارج تھیں۔ تعلیمی اداروں کے ہاسٹلز کی ذمّے داری زندگی بھر نبھاتے رہنے سے شخصیت میں جو سخت سا ڈسپلن آجاتا ہے، اس نے انہیں ہاسٹل میں رہنے والی اسٹوڈنٹس کے لیے خاصا ناپسندیدہ بنا رکھا تھا۔ اسٹوڈنٹس سے کچھ بات چیت بڑھی...... تو سبرینہ کو پتا چلا وہ انہیں سنڈریلا کہا کرتی تھیں۔
''ارے......؟'' اس نے دھیان سے انہیں دیکھا۔
گہری رنگت، چھوٹا سا قد، مختصر سا گرے بالوں کا جوڑا، جسے وہ اکثر کسی خفیہ کارروائی سے سیاہ بنا لیا کرتی تھیں۔ سوتی شلوار دوپٹا اور کبھی کبھی ہلکے رنگوں کی کلف لگی ہوئی ساڑیاں جو وہ کالج فنکشنز میں پہنا کرتی تھیں۔
ان میں اور سنڈریلا میں کیا قدر مشترک تھی بھلا۔ سنڈریلا تو شاید وہ تھی جو بارہ کا گجر بجنے سے پہلے اپنا مصنوعی پرستان چھوڑ کر دیوزادے کی قید سے فرار ہونے میں کامیاب ہوئی تھی...... اسے کہاں، کہاں اور کیسے نہیں تلاش کیا گیا ہوگا...... سبرینہ کے لیے اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا۔

☆☆☆

وہ دن لاہور کے ایک اچھی شہرت والے معروف کالج کے ہاسٹل میں گزار کر وہ پیر کی شام مس وکٹوریہ کے ساتھ دوبارہ برٹش کونسل پہنچی تھی مگر عمارت کے گیٹ کے قریب اترنے سے پہلے ہی اس نے ایک دشمن چہرہ پہچان لیا تھا۔ جو فاروق کے گھر کی قید کا ٹتے رات کو اس کی کھڑکی کھلنے اور بند ہونے کے حساب رکھا کرتا تھا۔ علم دار حسین......
وہ جس رکشے پر بیٹھ کر یہاں تک آئی تھی اس کی سیٹ سے پاؤں اتارے بغیر اس نے وکٹوریہ سے رکشا واپس موڑنے کی درخواست کی تھی۔ وکٹوریہ نے پچھلے دو دنوں میں اس سے زیادہ کچھ نہیں پوچھا تھا۔ مگر وہ چونک، چونک کر پلٹتی، پیچھے مڑ مڑ کر دیکھتی لڑکی کی آنکھوں میں پھیلے اس بے تحاشا خوف کو خوب پڑھ سکتی تھیں۔ جس نے پچھلے دو دنوں میں اسے بستر پر لیٹ کر بھی آنکھیں جھپکنے نہیں دی تھیں۔ وہ ایک لفظ کہے بغیر مان گئیں مگر کالج ہاسٹل کے سوا کہاں لے جاتیں۔
اس کی قسمت اچھی تھی...... کہ مس وکٹوریہ کی مہمان بننے کے چند ہی دنوں بعد اسے کالج میں انگریزی کی ایک جونیئر لیکچرر کی میٹرنٹی لیو پر جانے اور کسی متبادل ٹیچر کی تلاش کے بارے میں علم ہوا...... یہ بھی اس کی قسمت ہی تھی کہ تھرڈ ائیر کی کلاس کو انگریزی پڑھانے کے لیے اس کی قابلیت کو کسی مقامی چیلنج کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔
زندگی کو گزارنے کے لیے انسانوں کی مہربانی کی ضرورت ہوتی ہے مگر شاید اس سے بھی زیادہ ایک جائز روزگار کی...... اس کے پاس نہ اپنا پاسپورٹ تھا نہ پاکستان میں قیام کا اجازت نامہ...... پھر بھی وہ اپنا ضروری سامان لے کر فاروق کے گھر سے نکلی تھی۔ اس میں اس کی بیچلرز کی ڈگری کا ایک کاغذی ثبوت موجود تھا۔
وہ اس نیک دل سنڈریلا کی سخت احسان مند تھی جو اگر اس روز برٹش کونسل کے گیٹ پر مدد کا فرشتہ بن کر نہ پہنچتیں تو وہ پتا نہیں آج کہاں ہوتی...... ہوتی بھی کہ نہیں...... اس نے عارضی بنیادوں پر ملنے والے روزگار کی خوشی میں ایما سے رابطے کی کوشش کی تھی مگر وہ دنیا کے کسی کونے میں کیا کر رہی ہوگی......؟ سبرینہ اس کا صرف اندازہ ہی لگا سکتی تھی...... اس کے اپنے باپ کے پتے پر لکھے جانے والے کسی خط کا جواب نہیں آیا تھا پھر بھی ہر ویک اینڈ پر ایما کو خط لکھنا ایک دلچسپ مشغلہ بن گیا تھا۔ شروع کے چند خطوط کے سوا اس نے اب ایما کو لکھے خط پوسٹ کرنے بھی چھوڑ دیے تھے۔
کالج پرنسپل کا اعتماد حاصل کرنے میں اسے زیادہ محنت نہیں کرنی پڑی۔
''مجھے انسانوں کی پہچان ہے۔'' وہ دھیمے انداز میں مسکرا کر کہتیں۔

کیا کیا دیکھا

جانے والے تیری یادوں کو بھلا کر دیکھا
لوحِ دل سے تیرا ہر نقش مٹا کر دیکھا
ساری دنیا کو نظر آنے لگے تیرے نقوش
جب بھی آنکھوں میں کبھی تجھ کو چھپا کر دیکھا
تیرے جاتے ہی خفا ہو گئی دنیا ساری
بڑا ہم نے یہ احساس مٹا کر دیکھا
سنگدل میری وفاؤں کا تو قائل نہ ہوا
زخم ہر بار نیا تُو نے لگا کر دیکھا
راس کیوں دوستی آئی نہ کسی کی ہم کو
ہم نے ہر طور سے پیمان نبھا کر دیکھا

از: صبا نور، لیہ

زیادہ عرصہ نہیں لگا تھا...... کچھ مہینے صرف انگلش کی لیکچرر چھٹی سے واپس آ گئی تھی مگر اب وہ تھرڈ اور فورتھ ائیر کی کلاسز کو میکرو اور مائیکرو اکنامکس کے کورسز پڑھا رہی تھی۔ اپنی اصل دلچسپی کا شعبہ اسے کالج کے فرسٹ ائیر ہاسٹل کی معاون انچارج بھی بنا دیا گیا تھا۔

''اسے اپنی دنیا میں واپس جانا ہے۔'' اس ارادے میں ایما کی طرف سے کوئی جواب نہ پا کر زیادہ شدت باقی نہیں رہی تھی لیکن وہ اس شہر میں کسی بھی وقت تلاش کی جاسکتی ہے۔ یہ خطرہ بہرحال موجود تھا۔ اس نے فلموں کے بہروپ بدلنے والے کرداروں کی طرح اپنا ہیئر اسٹائل تبدیل کر لیا تھا۔ اب اس کے گہرے براؤن بال لڑکوں کی طرح ترشے ہوئے اور چھوٹے، چھوٹے تھے وہ اگر لڑکا ہوتی تو داڑھی مونچھ بھی رکھ لیتی۔ لڑکی ہونا اس کے کسی کام کا نہیں تھا۔ وہ ہلکے رنگوں کے شلوار کرتے میں کلاس پر کلاس بدلتی رہتی۔ لڑکیاں اسے پسند کرنے لگی تھیں۔

☆☆☆

''زندگی کتنی عجیب سی ہے ناں......''

اس نے ہاسٹل کے لمبے کھلے برآمدے کے بیچ دیوار پر نصب قد آدم آئینے میں جھانکا...... جہاں اکثر صبح فرسٹ ائیر کی طالبات کلاس کے لیے نکلتے وقت اپنے بالوں پر آخری نظر ڈالتی تھیں۔ کچھ کو ٹوئیزر سے اپنی بھویں کھینچنے کے لیے یہ جگہ پسند تھی۔

''کبھی ہم سوچتے ہیں یہ ہوگا تو ہم یوں کریں گے، وہ ہوگا تو ہم یوں نہیں کریں گے۔ دراصل ہم بس وہی کرنے کے قابل ہیں جو ہم سے خود بخود ہو جاتا ہے۔ ارادے کرنے سے کام نہیں ہونے لگیں تو شاید دنیا کے کسی کام کو کبھی کوئی رکاوٹ نہ دیکھنی پڑے۔''

''ہائے میم سبرینہ......'' کالج سے واپس ہاسٹل آنے والی لڑکی اس کو شیشے میں اپنے عکس سے الجھتے دیکھ کر کھلکھلائی تھی اور اپنے کمرے میں چلی گئی تھی۔

''تم تمام زندگی یہاں چھپ کر نہیں بیٹھ سکتیں...... تمہیں اس کا سامنا کرنا ہوگا......'' وہ جس دن سے فہد مرتضیٰ سے مل کر آئی تھی۔ ایک زبردست الجھن میں تھی۔ وہ جانتی تھی وہ ساری زندگی یہاں چھپ کر نہیں بیٹھ سکتی لیکن ایسا کہنا اور بات ہے اور ایسا کرنا اور......

وہ اس شخص کا سامنا کر ہی نہیں سکتی تھی جس نے اس کی زندگی کی سب سے بڑی ناکامی کا باب اس مہارت سے لکھا تھا کہ وہ خود اپنی نظر میں شرمندہ اپنے سائے سے بھی خوفزدہ ہو گئی تھی۔ اسے اپنے اردگرد کسی انسان پر بھروسا نہیں رہا تھا۔ اس انسان پر بھی نہیں جو روز ایک نئے مشورے کے ساتھ اس کی محنت سے بنائی تاش کی جنت ملیا میٹ کرنے کے درپے ہو گیا تھا۔

''چلو اسے کورٹ لے جاتے ہیں، تین مہینے میں عدالت تمہارے حق میں فیصلہ دے، دے گی تم آزاد ہو جاؤ گی۔''

اسپتال والی ملاقات کے بعد وہ اس سے ملنے سے بھی مسلسل انکار کر رہی تھی۔

''تم اسے بالکل نہیں جانتے۔''

فہد نے فون کے ائیر پیس سے ایک اجنبی سی آواز کو کہتے سنا۔

''وہ تمہاری کورٹس خرید سکتا ہے۔ وہ تمہارے جج، تمہاری عدالتیں غائب کرواسکتا ہے۔ وہ ایسا ہی کرے گا۔''

''اوہ جانے دو، مجھے کیوں کبھی شبہ نہیں ہوا کہ تم اتنی بزدل ہو۔ یعنی کہ اتنی بزدل...... حد ہے۔''

اس کی کمزوری پر سخت تلملانے کے باوجود اس کے لیے یہ اندازہ لگانا قطعاً مشکل نہیں تھا کہ وہ انتہائی ذہانت کی حامل رہ چکنے والی بلند و بالا لڑکی اس کی سوچ سے کہیں بڑھ کر خوفزدہ ہے۔ خوف جو انسان سے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت چھین سکتا ہے۔

فہد مرتضیٰ تجسس میں مبتلا نہیں تھا۔ لیکن یہ جاننا چاہتا تھا کہ اس پر کس نوعیت کا تشدد کیا جاتا رہا ہے۔

لیکن وہ اس دن...... پہلے دن جو کھلی تھی، اس کے بعد دوبارہ نہیں کھلی۔ اس نے فہد کی مدد کو ایک معالج کا مشورہ سمجھ کر بھی قبول کرنے سے انکار کردیا...... سبرینہ سے دوبارہ ملنے کی ہر کوشش ناکام ہوگئی تو فہد نے فاروق سے ملنے کا فیصلہ کیا لیکن اس سے پہلے وہ سبرینہ کو کسی محفوظ مقام پر پہنچانا چاہتا تھا۔

☆☆☆

وہ اس سے ملنے کو تیار نہیں تھی۔ لیکن اسلام آباد کے ڈپلومیٹک اینکلیو سے کالج کے مرکزی دفتر میں ملایا جانے والا فون سبرینہ ہی کے لیے تھا۔ برطانوی ہائی کمیشن کو اس کے بارے میں، ان تمام ضروری تفصیلات سے آگاہ کردیا گیا تھا جو فہد مرتضیٰ کے علم میں تھیں اور جن کا جاننا اس کے ملک کے سفارتی عملے کے لیے ضروری تھا تاکہ وہ اس کے لازمی تحفظ کے اقدامات اٹھاسکیں۔

اسے فوری طور پر اسلام آباد پہنچنے کے لیے تیار رہنے کی ہدایت کی گئی تھی۔ اس کے پاس نہ اپنا پاسپورٹ تھا نہ پاکستان میں قیام کا کوئی قانونی اجازت نامہ...... نہ ہی ایسا کوئی ثبوت جس سے وہ اپنے آپ کو کسی معتبر یا غیر معتبر پاکستانی شہری کی بیوی ثابت کرسکتی۔ اس کے پاس اپنی شناخت کا واحد ثبوت صرف اور صرف ایک عدد تعلیمی سند تھی۔ جو معلوم نہیں اس کام کے لیے کافی تھی یا نہیں...... ہائی کمیشن کے عملے کا فون پر بات کرنے والا رکن حیران تھا کہ اس لڑکی نے جو برطانوی شہری تھی کیوں اتنا لمبا عرصہ انتظار کیا؟ کیوں اس نے کسی سے مدد طلب کرنے کی کوشش نہیں کی تھی؟ اس کے پاس اپنے عظیم نقصانات اور شاندار بے وقوفیوں کی حیران کن کہانی سنانے کے علاوہ بھی کچھ بہانے تھے۔

ہاں...... وہ وہی تھی سبرینہ گیبرئیل جس نے اب بھی خود پر سے اختیار نہیں کھویا۔ مگر جسے ایک بیکار انسان نے اپنی نقلی چمک، سطحی ذہانت اور جھوٹی محبت کے مکار جال میں اس آسانی سے جکڑے رکھا تھا کہ مزاحمت اور آزادی کی تتلی کہیں چپکے سے مرگئی تھی۔ اسے واقعی لگنے لگا تھا وہ ساری زندگی اس کالج کی چار دیواری میں خوش رہ سکتی ہے۔ اسے اب کسی کو کھونے کا ڈر نہیں...... اسے اب کسی کے ملنے کی آس نہیں...... اور شاید اس کے دل میں کہیں ایسی ہر خواہش بھی مرچکی ہے۔

''لیکن ایسا کیسے ہوتا ہے کہ اس زمین پر چلتے پھرتے زندہ انسان اپنے جیسے کسی دوسرے انسان سے سانس لینے کی خواہش بھی چھین لیں۔''

''کیوں نہیں، ایسا بھی ہوسکتا ہے اور سبرینہ کے ساتھ ہوا بھی تھا۔''

اس نے اپنے چھوٹے سے سفری سوٹ کیس کی زپ بند کرکے اسے دیوار سے لگا دیا۔ ''لیکن اگر ایسا ہوچکا تھا تو پھر اس نے فاروق کے جہنم سے فرار کا راستہ کیوں اختیار کیا......؟ اپنا ہینڈ بیگ کھولے، اپنی شناخت کے اکلوتے ثبوت کی موجودگی کا یقین کرتی وہ ایک بار پھر اپنا احتساب کررہی تھی۔ بے شک وہ ایک نئے سفر پر نکلنے کو تیار تھی۔

پرنسپل کو خدا حافظ کہتے...... اینڈریا اور ہاسٹل کی دیگر وارڈنز سے رخصت لیتے، مس وکٹوریہ اور تزئین اظہر کے گلے لگ کر روانہ ہوتے...... وہ کچھ ٹھیک سے نہیں جان سکی کہ وہ خوش تھی یا نہیں......

اسے ایک عجیب احساسِ جرم تھا...... اس نے کسی کا کچھ نہیں چرایا تھا پھر بھی اسے لگا وہ کوئی کام ادھورا چھوڑ کر جارہی ہے۔ آج بہت دن بعد اس کے دل میں میگی...... مریم فیروز معظم خان سے دوبارہ ملنے کی خواہش پیدا ہوئی تھی۔ کیا تھا، جو اپنی جان بچانے کے ساتھ میگی کے بارے

مانوس قطرہ اس نے خوب لمبی سانس میں بھر کر محسوس کیا۔
کیسی ہوتی ہے ناں آزادی کی خوشبو...... کوئی اس سے پوچھتا تو سہی...... افسوس اس شہر میں بھی اب ایسا کوئی نہیں...... جس کے ساتھ وہ آزادی کے ناچ میں شریک ہو سکے۔

وہ ملول ہونے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے ہوئے بھی سخت دلگیر ہو رہی تھی...... وہ امیگریشن سے باہر آئی، اپنا سوٹ کیس سامان والی بیلٹ سے اٹھایا اور گھسیٹ کر باہر لانے کے عرصے میں، ٹرمینل سے باہر جانے والے راستے پر اسے ایک چمکدار اور روشن چہرہ دکھائی دیا جو اس کی محبت میں کسی نیون سائن کی طرح دور سے جگمگ کر رہا تھا۔

''ایما...... اس کی پیاری بہن......'' اس روئے زمین پر باقی رہ جانے والا اس کا واحد خونی رشتہ......

وہ کتنی دیر تک اسے گلے سے لگائے روئے جا رہی تھی۔ کبھی ہنسے جا رہی تھی تو کبھی چومے جا رہی تھی۔ تاوقتیکہ کسی نے دونوں کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر انتہائی مہذبانہ معذرت سے انہیں ایک دوسرے سے الگ نہیں کر دیا۔

وہ جو بھی تھا...... اتنا دراز قد تھا کہ سبرینہ کو اسے دیکھنے کے لیے باقاعدہ سر اٹھانا پڑا۔

ایما کے پاس اس کے لیے سچ مچ کا سرپرائز تھا۔ ایما نے بالکل ہی کمال کر دیا تھا۔ اس کی اکلوتی اور سمجھدار بہن...... اب مسز ایما احمد الباسم تھی۔

اس کا دراز قد، دبلا پتلا فلسطینی، مسلمان شوہر فرانسیسی شہریت کا حامل تھا۔ ایما کی ملاقات اقوام متحدہ کے ایک رضا کار مشن کے دوران ہوئی تھی۔ اور شادی فرانس میں......

''وہ اتنا اچھا ہے، اتنا خیال رکھنے والا ماشاء اللہ کہ تم سوچ بھی نہیں سکتیں سبرینہ...... جب تک میں اس سے نہیں ملی تھی مجھے اندازہ نہیں تھا کہ میرے دل میں اتنی خالی جگہ ہے۔ اب میں سوچ بھی نہیں سکتی کہ زندگی میں کسی ایک دن بھی وہ میرے ساتھ نہیں ہو گا۔''

اس نے اپنے جملے میں ماشاء اللہ کا لفظ خالص عربی انداز میں زور دے کر ادا کیا تھا۔ وہ اپنے شوہر احمد سے ملاقات کا احوال سناتے اتنی اندرونی خوشی سے تمتما رہی تھی کہ سبرینہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

میں بھی کچھ معلوم کرنے کی کوشش کی ہوتی۔

اس نے پلٹ کر الوداعی کلمات کہتی، نیک دل ہستیوں کی ''اپنا بہت سا خیال رکھنا...... ہم سے رابطہ رکھنا'' جیسی مہربان تاکیدوں کا مسکرا کر جواب دیتے اپنے آپ کو سختی سے لتاڑا تھا۔

اس کے ہاتھ سے اس کا کم وزنی سوٹ کیس لینے والا ہائی کمیشن کے عملے کا رکن تھا جو اسلام آباد سے خاص لگژری گاڑی میں ڈرائیور کے ساتھ بائے روڈ اسے لینے آیا تھا۔

''اور سب سے اہم سوال یہ ہے کہ وہ جہاں جا رہی ہے، وہاں کون اس کی راہ میں آنکھیں بچھائے منتظر بیٹھا ہو گا؟'' اس نے گاڑی میں بیٹھتے ہی سوچا۔

''اور کتنا اچھا ہو، اگر اس سوال کا جواب پاؤں کے نیچے کی زمین چھوڑنے سے پہلے ہی مل جائے۔''

ہائی کمیشن کی سفید گاڑی رینگنا شروع ہو چکی تھی۔

اب تک وہ جیسے کسی المیہ کہانی کا کردار تھی، جس کا کلائمکس آنے سے ذرا پہلے ہی پکچر ختم کر دی گئی تھی۔ اس نے گاڑی کے شیشے کے پاس پیچھے رہ جانے والی کہانی کی سپورٹنگ کاسٹ کو ہاتھ ہلا کر ایک بار پھر خدا حافظ کہا تھا۔

اور اتنے دنوں میں پہلی بار اس کے دل میں جس شخص سے ملنے کی آرزو پیدا ہوئی تھی...... وہ وہی تھا جس کے مشورے ماننے اور جس سے ملنے سے وہ پچھلے کئی دنوں سے مسلسل انکار کرتی آ رہی تھی اور جس نے اس آخری ملاقات کے بعد ایک بار پھر اس کی مرضی کے خلاف اس سے ملنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

☆☆☆

لاہور سے اسلام آباد تک کا راستہ اور برطانوی ہائی کمیشن سے برٹش ائیرویز کی پہلی دستیاب پرواز پر لندن اترنے تک کا زمینی اور فضائی فاصلہ جتنا بھی مختصر ہوتا اسے لگا وہ ایک ساحری کے طلسم کدے میں صدیوں تک سوئے رہنے کے بعد اچانک زندہ ہو گئی تھی۔

یہ لندن تھا...... اس کا اپنا...... خنکی بھرے آسمان کے نیچے بجلیاں کڑکڑاتے بادلوں سے گرنے والا بارش کا پہلا

"اور پھر مجھے احساس ہوا کہ تم نے وہ فیصلہ کیوں کیا تھا، مجھے معاف کر دو سبرینہ...... میں نے تمہیں غلط سمجھا تھا۔ جبکہ میں خود غلط تھی۔"

اس کی پیاری بہن اس کے باپ کی ڈائننگ ٹیبل پر اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھے اپنی ایک ایسی کوتاہی کا اعتراف کر رہی تھی جو اس کی تھی ہی نہیں...... اس کی جگہ کوئی بھی ہوتا تو یہی کرتا۔

کافی کے خالی مگ کے کنارے کو اپنے انگوٹھے کی پور سے ہلکے، ہلکے سہلاتے وہ جیسے نئے سرے سے خود کو یقین دلانا چاہتی تھی کہ تحفظ، سچی خوشی اور اچھی امید، اسی زمین پر انسانوں کا ہاتھ تھامتی ہیں۔

"خصوصاً ان کا تو ضرور جنھوں نے اپنی فکر کرنے والوں کا دل نہیں دکھایا ہوتا۔" اس کے دل میں کہیں آلتی پالتی مارے گیان میں مصروف محتسب نے آرام سے ایک چٹکی کاٹی تھی۔

"ڈیڈی کے جانے کے بعد میرے لیے یہاں رہنے کا کوئی مطلب ہی نہیں تھا۔" ایما کہہ رہی تھی۔ "مجھے ہر صورت یہاں سے جانا تھا۔ تمہارا کبھی کوئی خط نہیں آیا، کوئی فون نہیں آیا تو میں نے مان لیا کہ تم اپنی زندگی میں اتنی خوش ہو کہ تمہیں ہماری کوئی ضرورت نہیں، مجھے معاف کر دینا سبرینہ۔"

باپ کے مرنے کے بعد سے ایما کا زیادہ وقت اپنے رضا کار مشنز پر ہی گزرتا رہا تھا۔ سبرینہ کے پچھلے ایک سال کے خطوط اس نے لندن واپس آنے پر اپنے گھر کے میل باکس میں اکٹھی ہونے والی اس ڈاک سے نکالے تھے۔ جس میں اب مزید کی جگہ نہیں رہی تھی۔

سبرینہ پر کیا گزری...... اس کا اولین اندازہ اسے اپنے یو این مشن کے سرکاری میل باکس میں ایک اجنبی نام سے موصول ہونے والے خط سے ہوا۔ فہد مرتضٰی نامی اس شخص نے کچھ زیادہ نہیں بس اتنا لکھا تھا کہ سبرینہ جلد لندن پہنچنے والی ہے اور ایما کو اسے ہر طرح کی مورل سپورٹ دینی ہوگی۔ انٹرنیٹ ابھی عام نہیں ہوا تھا۔ ایسے میں جس شخص نے ایما کو اقوام متحدہ دفاتر کے آفیشل انڈیکس اور فون نمبروں کے سہارے ڈھونڈ نکالا، وہ اس کی بے حد احسان مند تھی۔

سبرینہ نے بہت ایمانداری سے سوچا تھا۔ اسے سب کو سب کچھ معاف کر دینا چاہیے مگر دنیا چھوڑ دینے والے اپنے باپ سے خود اپنی نافرمانی اور بدگمانیوں کی معافی کیسے ملے گی۔ اس کا جواب اس کے پاس نہیں تھا۔

☆☆☆

فہد مرتضٰی نے کتاب بند کر کے بہت دیر پہلے اپنے سامنے میز پر رکھی تھی۔ کتاب کے ٹائٹل پر بنے سنہرے چمکدار کیس میں ایک خوب صورت رنگوں والی حسین تتلی کی تصویر تھی...... تتلی کے دونوں پروں پر لوہے کی موٹی میخیں گاڑ کر اسے کیس کی دیوار سے چپکا دیا گیا تھا۔ کیس کے شفاف شیشے کے باہر، اپنی مکروہ تھوتنی چپکائے، ایک خوفناک صورت، کالا سیاہ بلا اپنے سالم شکار کو دبوچنے کے لیے تیار تھا۔ اس کی پُراسرار آنکھوں کی پتلیوں میں تتلی کی تصویر اور پس منظر میں ہریالی اور سبزہ دور تک دیکھا جا سکتا تھا۔

فہد نے کتاب کا نام اور اس کے نیچے لکھی عبارت کو ایک بار پھر بہت دھیان سے پڑھا تھا۔

Tale of a fairy

Hard bargains and bitter truths

کتاب کے پہلے باب کا عنوان تھا۔

Maggy - the artist

کسی انگریزی روزنامے کے نقاد کی نظر سے دیکھیں...... تو کتاب کا پہلا باب مکمل فکشن معلوم ہوتا تھا۔ البتہ بیک ٹائٹل پر مصنفہ کی چند سالہ تحقیق کا ذکر تھا...... کتاب کے اندرونی فلیپ پر جملہ حقوق بحق مصنفہ محفوظ ہونے کی اطلاع ایک ذہین آنکھوں اور مسکراتے چہرے والی تصویر کے ساتھ درج تھی۔ برطانیہ کے ایک بہت پرانے اور معتبر میک ملن پبلشرز کی چھاپی ہوئی یہ کتاب، دسمبر انیس سو چورانوے میں شائع ہوئی تھی۔ پبلشرز کو کتاب کے مندرجات پر پورا یقین تھا یا نہیں...... پاکستانی اشرافیہ کے ایک مخصوص طبقے کی طرف سے غیر ملکی مصنفہ اور پبلشر کی نیت کے بارے میں سخت شبہات کا اظہار کیا جا رہا تھا۔

جاگیردار طبقے سے ہی اٹھنے والی عوامی حکومت کا تیسرا دور تھا۔ ملک کی قیادت، اعلیٰ برطانوی یونیورسٹی سے تعلیم یافتہ،

بے داغ برٹش انگریزی میں پریس کانفرنسز کرنے والی خاتون وزیر اعظم کے ہاتھ میں تھی۔ جنہیں تاریخی طور پر دوسری بار وزیر اعظم کا پورٹ فولیو سنبھالے ایک سال اور چار مہینے ہوئے تھے۔ حزبِ اختلاف کی روایت پسند سیاسی جماعتیں اپنے، اپنے حلقۂ انتخاب میں، ووٹ نام کی بے معنی پرچی ڈالنے پر قادر بھیڑ بکریوں جیسی عوام کو یقین دلانا چاہتی تھیں کہ عورت کا اقتدار اسلام میں جائز ہو ہی نہیں سکتا۔

فہد مرتضیٰ نے کتاب کے پاس تہ کیے رکھے گزشتہ دن کے باسی ڈان انگریزی اخبار کو دوبارہ کھول کر سیدھا کیا۔ اخبار کے اندرونی صفحے پر ایک چھوٹی سی بلیک اینڈ وائٹ تصویر اور چند ہی حروف پر مبنی دوسطری خبر تھی۔ ابھی ابھی جس کتاب کے نفس مضمون کو اس نے پچھلے ایک ماہ میں پتا نہیں کتنی بار دُہرایا تھا۔ اس کی مصنفہ سبرینہ گیبریئل پاکستان پہنچ چکی تھی۔

اس نے اٹھ کر اپنے کمرے کی کھڑکی سے پردے ہٹادیے تھے۔

☆☆☆

وہ ویسی ہی تھی جیسی اس سے آخری ملاقات میں دکھائی دی تھی۔ نازک سی، سادہ اور شفاف سی، کندھوں تک آتے گہرے براؤن بالوں اور میرون اور سیاہ سوسی کے کرتے میں سفید شلوار دوپٹے کے ساتھ...... پتا نہیں وہ سب کو اتنی اچھی لگتی ہوگی یا ایسا اس کے ساتھ ہی تھا۔ وہ گرلز کالج کی اس تقریب میں ہال کی اولین قطاروں میں سے ایک پر موجود تھا۔ جہاں ابھی چند ماہ پہلے ہی اس کی بہن لیکچرر تعینات ہوئی تھی۔

ڈیبیٹنگ کلب کی پُراعتماد طالبہ، بالوں کی سیدھی مانگ نکالے، بے داغ لہجے میں پینل پر موجود سبرینہ گیبریئل کو دعوتِ خطاب دے چکی تھی...... اور اب تالیوں کے شور میں ڈائس پر منتظر کھڑی تھی۔ کالج کی پرنسپل کے ساتھ بیٹھی وہ سنجیدہ سی لڑکی کہیں سے بھی کسی بھی طرح ایک ظالم دیوزادے کی قید سے فرار ہوئی تتلی معلوم نہیں ہوتی تھی۔

''کاش ہم ان بدذات عورتوں کو اپنے ملک کا نام مٹی میں ملانے سے روک سکیں۔'' بڑبڑاہٹ کی آواز فہد کے برابر والی نشست سے آئی تھی۔ اس نے گردن موڑ کر دیکھا۔ وہ ایک انگریزی روزنامے کا صحافی تھا، سلیقے سے تراشی ہوئی، گرے داڑھی اور سر پر موجود خوب گھنے سرمئی بالوں کے ساتھ۔

''کیا آپ نے خاتون کی کتاب پڑھی ہے، زبیری صاحب؟'' فہد مرتضیٰ نے اردو میں پوچھا تھا۔ صحافی نے کندھے اچکا دیے تھے۔

''اوہ...... یہ سب ایک جیسی ہوتی ہیں۔ ہر کوئی اپنے بارے میں کہیں کی ستی ساوتری اور عظیم عورت ہونے کا دعویٰ کرتی ہے۔ آپ ہی بتائیں ڈاکٹر مرتضیٰ آج کے زمانے میں کس کے پاس ایسی عورتوں کی لکھی بیکار کتابیں پڑھنے کا وقت ہے؟'' فہد مرتضیٰ کے چہرے کی سنجیدگی گہری ہوگئی۔

''تو پھر مجھے افسوس ہے، میں سمجھا نہیں، آپ کو اعتراض کس بات پر ہے؟'' اس کے جواب نے صحافی کو مزید کچھ کہنے سے روک دیا تھا۔ صاف ظاہر تھا، ڈاکٹر مرتضیٰ کو جیسے وہ کسی اور حوالے سے اچھی طرح جانتا تھا۔ اس کی بات مزید سننے میں زیادہ دلچسپی نہیں تھی۔ وہاں ڈائس پر سبرینہ گیبریئل، پاکستانی معیشت اور معاشرے کو درپیش کچھ اہم مسائل پر تفصیلی تجزیہ کرنے کے بعد اب کچھ حل تجویز کررہی تھی۔ جن میں سب سے اہم تھا۔

''تعلیم اور معاشی ترقی سب کے لیے...... اور تعلیمی نظام ایک جیسا۔''

پینل ختم ہونے کے بعد، کالج کی نوجوان لیکچرر ریما مرتضیٰ نے اپنے عزیز بھائی کو تیزی سے باہر اس میز تک جاتے دیکھا تھا جہاں ڈاکٹر سبرینہ گیبریئل اپنی کتاب

Hard bargains and bitter truths

کی کاپیاں، خریدنے والی لڑکیوں کو اپنے دستخط کر کے دے رہی تھی۔

یہ بے حد دلچسپ منظر تھا۔ ریما مرتضیٰ چند سال پہلے اسی کالج میں ڈاکٹر سبرینہ گیبریئل سے اکنامکس پڑھ چکی تھی۔ انہی دنوں جب اسے ہلکا سا شبہ ہوا تھا کہ اس کا سنجیدہ بھائی اسے کالج لانے، لے جانے میں کچھ غیر معمولی دلچسپی لے رہا ہے۔ آج اسے اپنے سوال کا جواب مل گیا تھا۔ یہ انکشاف حیرت انگیز بھی تھا اور خوشگوار بھی۔

مگر شاید یہ بات اتنی سادہ نہیں تھی۔

سبرینہ کی میز تک آنے والا بلاشبہ وہی شخص تھا جس سے ایک بار پھر ملنے کی اس نے بارہا خواہش کی تھی...... صرف خواہش......

وہ اس سے اس کی کتاب پر دستخط کروانے آیا تھا۔ اور نہ کوئی مشکل سی بات کہنے...... وہ اسے کسی سے ملوانا چاہتا تھا۔

''کس سے......؟'' یہ سوال سبرینہ نے پوچھا ہی نہیں۔

☆☆☆

سبرینہ گیبرئیل...... دنیا کے اربوں انسانوں میں ایک بے معنی نام...... ایک نکتہ، ایک ذرہ...... ایک کمزور لڑکی کہ جس کی لاش چند سال پہلے مملکتِ خداداد کے کسی نامعلوم مقام پر خاموشی سے کٹ کر گرنے والی گمنام چڑیا کی طرح چیل کوؤں کو کھلادی گئی ہوتی۔ آج فہد مرتضٰی کی گاڑی میں دن دہاڑے شہر لاہور کی سڑکوں پر کسی گنجان آباد علاقے کی طرف دوڑی جارہی تھی۔

ان کے درمیان بات چیت نہ ہونے کے برابر ہوئی تھی فہد نے اس کی میز پر جھک کر صرف اتنا ہی کہا تھا۔

''تو زندگی آپ کے ساتھ اچھا برتاؤ کر رہی ہے، ڈاکٹر گیبرئیل؟'' لیکن اس کی آنکھوں سے اترتی ہلکی سی مسکراہٹ میں سوال نہیں تھا، اسے جواب معلوم تھا۔

زندگی نے پچھلے کچھ سالوں میں واقعی سبرینہ کے ساتھ اچھا سلوک کیا تھا۔ اسے کسی سے کوئی شکایت نہیں تھی۔ سوائے اپنے آپ سے۔ اس کی فہرست میں درج گناہوں میں، ایک گناہ تھا میگنا کارٹا...... بیگم مریم فیروز معظم خان کی خیریت دریافت نہ کرنے کا گناہ۔ میگی سے آخری بار ملے زیادہ نہیں تو بھی کچھ سال گزر چکے تھے۔

فہد مرتضٰی اسے جہاں لایا تھا وہ پرانے لاہور کی نچلی متوسط آبادی میں قائم ایک بہت بڑے رقبے پر واقع کسی غیر سرکاری ادارے کا قائم کیا ہوا اسکول اور اسپتال برائے ذہنی امراض تھا۔ یہاں قدرے کم متاثرہ مریضوں کو مختلف غیر روایتی طریقوں سے علاج اور تھراپی مہیا کی جاتی تھی۔ یہاں بہت سے بچے بھی تھے۔

اس نے دیکھا فہد اس کی رہنمائی کرتا، جہاں تک آکر رک گیا تھا۔ وہ ایک کلاس روم کا کھلا دروازہ تھا۔ بلیک بورڈ پر رنگ برنگے چاک سے بنے انتہائی خوب صورت پھولوں کا گلدستہ، جاپانی فلورل آرٹ کی زبردست مثال پیش کر رہا تھا۔ دس، بارہ اور پندرہ سال کے کچھ بچے جن کی حرکات مکمل صحت مند بچوں جیسی ہی تھی۔ کلاس روم کے بیچوں بیچ ٹیچر کی میز کے گرد جمع تھے۔ ٹیچر ڈرائنگ بورڈ پر پینسل سے کوئی زبردست سا خاکہ بنا کر اس میں تیزی سے ہاتھ چلاتی شیڈنگ کر رہی تھیں۔ اپنے ہاتھوں کی حرکت پر نظر جمائے، بچوں کے پُرتجسس چہروں کے پیچھے ٹیچر کو کسی غیر معمولی آہٹ کا احساس ہوا تھا۔ اس نے بچوں کی پُرشوق آنکھوں کے اُدھر، گردن اٹھا کر دیکھا تھا اور کلاس روم کے دروازے سے جھانکتی جانی پہچانی لڑکی کے منہ سے بے ساختہ ایک چیخ بلند ہوئی تھی۔

''او مائی گاڈ......'' وہ ایک شاک کی کیفیت میں حیرت کی زیادتی سے کھلتے اپنے منہ پر ہاتھ رکھے بے اختیار آگے بڑھی تھی۔

آرٹ ٹیچر نے دیکھا۔ یہ معتبری کچھ، کچھ کامیاب نظر آنے والی اچھی سی لڑکی وہی تھی جسے اس نے خود فاروق فیروز خان کے سنہری پنجرے میں اپنی آخری ملاقات کے وقت سمجھدار نہ ہونے کا طعنہ دیا تھا۔

سبرینہ دوڑتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی تھی۔ اس نے پچھلے چند برسوں میں خود پر ضبط کا جو پہرہ بٹھایا تھا اسے بے ساختہ توڑتی ہوئی وہ کب سے مسلسل روئے جارہی تھی۔ مریم فیروز معظم خان نام کی سفید بالوں والی بزرگ آرٹ ٹیچر کو آج کلاس وقت سے پہلے برخاست کرنی پڑی تھی۔ سبرینہ بار، بار اس کے سفید بالوں اور بوڑھے چہرے کو اپنے ہاتھوں سے چھو کر یقین کرنا چاہتی تھی کہ وہ میگی ہی ہے۔

مریم فیروز معظم خان...... وہ وہی تھی مگر جہاں تھی وہاں پہنچنے میں اس کی اپنی زبردست قوتِ مدافعت کے ساتھ اس کلاس روم میں موجود خاموش کھڑے تیسرے فرد کی مہربانی کا بھی دخل تھا۔

فیروز معظم خان کا سومنات گر چکا تھا۔ اس کے بیٹوں میں پھوٹ پڑ چکی تھی۔ سبرینہ گیبرئیل، فاروق فیروز نام کے جس مٹی کے پتلے کے ہاتھوں اتنے سال یرغمال بنی رہی، وہ

کب کا اپنی جان کے خوف سے اپنے باپ کے تمام لیکوڈ اثاثے بیچ کر پاکستان سے فرار ہو چکا تھا۔ وہ کس ملک میں تھا میگی کچھ ٹھیک سے نہیں بتا سکی۔ مگر اس کے جرائم کی فہرست میگی کے مرحوم شوہر فیروز معظم خان سے زیادہ بڑی نہیں تھی۔ پھر بھی اس کے خلاف حکومتِ پاکستان کی اعلیٰ عدلیہ میں راتوں رات اتنے بڑے کون سے مقدمے دائر کیے گئے تھے کہ اگر فرار نہ ہوتا تو ساری زندگی جیل میں کاٹنی پڑ سکتی تھی۔

اس کے خاندان کو ملنے والی انگریز کے زمانے کی لامحدود جاگیر کا ایک حصہ ان اربوں ڈالر کے قرض کی ادائیگی میں بک چکا تھا۔ جنہیں روپوں میں تبدیل کر کے گننا آسان نہیں تھا۔ یہ بری قسمت ہی تھی کہ اس بااثر خاندان کی نئی نسل کے غیر محتاط رویے اور سیاسی وابستگیاں قومی سطح کے سب سے بڑے کھیل میں اترتے ہی سب سے پہلے جس کے گلے کا پھندا بنیں...... وہ وہی تھا فاروق فیروز خان......

میگی، سبرینہ کو بتا رہی تھی کہ اس کے خیال میں وہ اپنے باپ سے کئی گنا زیادہ اور جلد جائداد، دولت، شہرت ... حاصل کرنا چاہتا تھا۔ یہی خواہش اسے ڈبونے کا باعث بن گئی۔

سبرینہ نے کسی کو کبھی نہیں بتایا کہ دو سال پہلے آدھی رات کو اس کے اپارٹمنٹ کے فون کی گھنٹی کیوں بجی تھی۔ دوسری طرف سے سنائی دینے والی آواز کو وہ خواب میں سن کر بھی دہشت زدہ ہو سکتی تھی۔ وہ اسے کسی بھی ملک کی عدالت میں، کسی بھی کیس میں اپنے خلاف گواہ کے طور پر پیش ہونے سے انکار کے بدلے اس نام نہاد رشتے سے آزادی کی پیش کش کر رہا تھا۔ جسے وہ بہت پیچھے چھوڑ آئی تھی۔ سبرینہ نے ایسا کوئی وعدہ نہیں کیا تھا...... پھر بھی ایک دن اس کے میل باکس سے نکلنے والی ڈاک میں اس بڑے سے خاکی لفافے پر وہ فاروق فیروز خان کی ہینڈ رائٹنگ پہچان سکتی تھی۔ اسے آزاد کر دیا گیا تھا۔

☆☆☆

میگی کی کہانی کو نیا موڑ اس وقت ملا جب فاروق اپنے سیاسی دشمنوں کی طرف سے قائم کیے گئے قتل اور غداری کے زبردست مقدموں میں بری طرح پھنسا...... اپنے بچاؤ کے لیے ہاتھ پیر مار رہا تھا...... اور اس کا زور دار اثر رسوخ والا باپ فیروز معظم خان عین انہی دنوں ایک رات سو کر دوبارہ نہیں اٹھ سکا تھا۔

موضع محمد خان میں کوئی کبھی نہیں جان سکا کہ علاقے کا بڑا جاگیردار، آخری عمر میں...... جس بیماری سے چپ چاپ ختم ہوا اسے ایڈز کہتے ہیں۔ فیروز معظم خان کی کتنی زندہ بیویاں ایچ آئی وی پوزیٹو تھیں۔ کوئی ٹھیک سے نہیں بتا سکتا...... میگی البتہ یہ ضرور جانتی تھی کہ وہ خود ایچ آئی وی پوزیٹو ہے۔ اکثر کھانسی کا شکار رہتی ہے، جلد تھک جاتی ہے لیکن جتنے دن بھی زندہ ہے، دنیا کے غم کم کرنا چاہتی ہے۔

وہ عورت جس کا نام فہد نے سبرینہ گیبرئیل سے اپنے کلینک میں ہونے والی اکلوتی ملاقات میں ایک سے زیادہ بار سنا تھا۔ وہ بیمار اور لاغر عورت اتنی اچھی آرٹسٹ ہو سکتی ہے۔ شاید وہ کبھی یقین نہیں کر پاتا۔ اگر اپنی آنکھوں سے فاروق فیروز خان کے محل کی دیواروں پر وہ پینٹنگز نہ دیکھ چکا ہوتا...... جو ماسٹر پیس نہ ہو کر بھی کسی زبردست فنکار ہاتھوں کی مہارت کا ثبوت تھیں...... وہ کچھ ایسا کلاسکی نوعیت کا خاص کام تھا کہ وہ بے ساختہ تجسس سے مجبور ہو کر ایک پینٹنگ کے قریب گیا تھا۔ اس نے ابھرے ہوئے آئل پینٹ والی تصویر کے ہر غیر نمایاں کونے میں آرٹسٹ کا نام تلاش کرنے کی کوشش کی تھی۔ مصور کا نام اس کی توقع کے عین مطابق تھا...... ''میگنا کارٹا''

زندگی اتفاقات سے بھری ہوئی ہے، بس کبھی کبھار وہ صحیح وقت پر صحیح جگہ بھی ہو جاتے ہیں۔ اس روز سبرینہ کو محفوظ مقام پر پہنچانے کے لیے کی گئی چند ضروری فون کالز اور اپنے ڈسٹرکٹ مینجمنٹ گروپ سے تعلق رکھنے والے بار رسوخ بھائی سے کچھ جوابی اور اہم یقین دہانیاں حاصل کرنے کے بعد اس نے خود فاروق سے ملاقات کا ارادہ کیا تھا۔

وہ گاڑی چلا کر آٹھ گھنٹوں میں لاہور سے موضع محمد خان پہنچا تھا۔

بارہ سے چودہ فٹ بلند دیواریں اور کانٹے دار لوہے کی باڑھ سے بوجھل ہیبت ناک کمپاؤنڈ جسے دیکھ کر اس میں رہنے والوں کے کروفر کا اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا۔

اسے سخت حفاظتی انتظامات والے گیٹ کو پار کرنے کی

اجازت صرف اس لیے ملی کہ پکے قلعے کے بھاری بھرکم آہنی گیٹ کے باہر اس کی ہارن دیتی گاڑی کے بالکل پیچھے ایک اور بہت بڑی گاڑی عین اسی وقت رکی تھی...... جس میں بیٹھے اسلحہ برداروں میں سے ایک فاروق اور فیروز معظم خان کے لاہور میں رہنے والے چند دوستوں سے واقف تھا۔ علم دار حسین...... اس نے فہد کو پہچان کر اپنے ہاتھ میں پکڑی جدید پسٹل کا بیرل نیچے کرلیا تھا اور گاڑی سے اتر کر گیٹ پر لگے انٹر کام کے ذریعے گیٹ کے دوسرے سرے پر موجود گارڈز کو اسے اندر آنے دینے کی ہدایت کی تھی۔ فہد کی گاڑی کو جاگیر پر آنے والے مہمان کے گیسٹ ہاؤس تک گارڈز نے اپنی حفاظت میں پہنچایا تھا۔ پھلوں سے لدے پھندے دور تک پھیلے ان گنت درختوں کے جھنڈ میں قائم یہ عظیم الشان عمارت جاگیر کا صرف عارضی گیسٹ ہاؤس تھی۔

اسے بتایا گیا تھا کہ فاروق جہاں بھی ہے وہاں سے رات تک واپس آسکتا ہے۔

وہ ساری شام فہد مرتضیٰ نے گیسٹ ہاؤس کی انتہائی قیمتی آرائش اور مالکوں کی حقیقی رہائش گاہ کے جاہ وجلال کے درمیان خیالی تقابل کرنے میں گزاری تھی۔ وہیں اس نے میکنا کارٹا نام کی مصورہ اور اس کے فن پاروں کو اپنی آنکھوں سے دریافت بھی کرلیا تھا۔

مریم فیروز معظم خان نے دیکھا ڈرائنگ روم میں کسی کے انتظار میں ٹہلنے والا صورت سے ہی فاروق کے باقی دوستوں جیسا نہیں لگ رہا تھا۔ وہ بے چین سا قیمتی ایرانی قالین پر خوب اچھی طرح ٹہلنے اور انتظار کرنے کے بعد اب ڈرائنگ روم کی دیواروں پر لگی بڑی، بڑی پینٹنگز کو قریب جا کر غور سے دیکھ رہا تھا۔ مریم نے دیکھا اس نے کونے میں ابھرے اس کے ننھے سے نام کو بہت غور سے پڑھا تھا۔ وہ یقیناً اس خاندان کے دیگر ملنے والوں سے مختلف تھا۔ اسے کسی کی تلاش تھی۔

مریم گیسٹ ہاؤس کے مہمانوں کی میزبانی سے عرصہ ہوا کنارہ کر چکی تھیں۔ اب تو اکثر ان کا گیسٹ ہاؤس تک آنا بھی نہیں ہوتا تھا۔ ان کی جواب دیتی صحت، کب کی ایسی پابندیوں سے آزاد ہو چکی تھی۔ آج خواہ مخواہ ہی عمارت کے اس حصے کی طرف آئی تھیں۔

''اسے میں نے پینٹ کیا ہے۔'' اس نے برطانوی لہجے میں کہا۔

وہ اس کے ہاتھ سے بنی بلا مبالغہ چوتھی پینٹنگ کو خراجِ تحسین پیش کرتا چاروں کونوں میں مصور کے نام کی تلاش میں نظریں دوڑا رہا تھا۔ جب کسی نے کسی قدر سکون سے پیچھے سے آکر اس کی مشکل آسان کی تھی۔ وہ سیدھا ہو کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے سامنے سبرینہ گیبرئیل کی ادھوری کچھ، کچھ غیر واضح کہانی کے کم از کم ایک کردار کے نقش واضح ہو رہے تھے۔

''اگر میں غلطی نہیں کر رہا تو آپ میگی ہیں، میکنا کارٹا...... آپ سے مل کر خوشی ہوئی میم۔''

لاہور سے چلتے وقت فاروق کے علاوہ جس دوسری شخصیت سے ملنے کا خیال فہد کے دل میں تھا وہ میگی ہی تھی۔

فہد ذہنی امراض کا معالج، ایک نفسیات دان تھا۔ وہ یہ جاننے میں دلچسپی رکھتا تھا کہ انسانی ذہن، انتہائی ناپسندیدہ حالات میں رہنے پر مجبور کردیا جائے تو قدرت اس سے مقابلے کے لیے کون سا مدافعتی نظام حرکت میں لاتی ہے۔ عموماً انتہائی ناموافق اور ناپسندیدہ حالات میں ہونے والے ہر انسان کے اندر ایسی صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے قدرت کا اپنا بنایا ہوا دفاعی نظام، ایک غیر متوقع شخصیت کے جنم کا باعث بنتا ہے۔ اکثر ظلم سہنے والے ظلم کرنے والے بن جاتے ہیں۔ ساس کا ظلم سہنے والی، اس سے بھی ظالم ساس بنتی ہے۔ سخت مزاج باپ کا بیٹا اس سے بھی سخت مزاج سربراہ ثابت ہوتا ہے۔ میگی کی ٹوٹی پھوٹی عزتِ نفس کو بچائے رکھنے والی زرہ بکتر، اپنی گھٹن کو اپنے آرٹ کے ذریعے باہر نکالنے کا راستہ تھا۔ فہد کو اپنے کچھ اور سوالوں کے جواب بھی ملے تھے۔

یہ وہ عورت تھی جو سبرینہ گیبرئیل کی کہانی کا سب سے اہم کردار اور اس قلعہ نما قید خانے سے اس کے فرار کا سب سے مضبوط محرک ثابت ہوئی تھی۔ فہد کی اپنی ماں سے بھی کہیں بزرگ میگی کے سفید چاندی ایسے بالوں اور کشادہ پیشانی کے نیچے دو تھکی ہوئی آنکھیں، کسی انجانے عارضے کا پتا بھی دے رہی تھیں۔ فاروق تو اس رات جاگیر پر واپس

نہیں آیا تھا...... لیکن فہد مرتضیٰ نے مریم فیروز خان کو اپنے ہر نوعیت کے رابطے کی تفصیلات اور کسی بھی مشکل کی صورت میں اپنے تمام فون نمبر لکھ کر دے دیے تھے۔

''مشکل کی صورت میں؟'' مریم نے جاگیر سے بحفاظت رخصت ہوتی فہد کی گاڑی کو دیکھ کر زیرِ لب دُہرایا تھا لیکن وہ ایسا کوئی ارادہ نہیں رکھتی تھی۔ تاوقتیکہ ایک صبح، جاگیر کی اصلی والی خاندانی بیگم کی حویلی میں کہرام مچ گیا۔ ساری زندگی انسانوں کو حقیر کیڑوں کی طرح مسل کر ایذائیں دینے والا میکی کا دیوزادہ ایک ایسے مرض کے ہاتھوں چپ چاپ ختم ہوگیا تھا جس کا ابھی کوئی علاج دنیائے سائنس نے دریافت نہیں کیا تھا۔

فاروق کا اتا پتا ان دنوں سوائے چند لوگوں کے کسی کے علم میں نہیں تھا۔ وہ ایک پُراسرار مقدمے میں پھنسا ہُوا، کئی دن جاگیر پر آتے کا راستہ بھولا ہوا تھا۔ اور اس کا راستہ ایسا کھویا تھا کہ اپنے باپ کے جنازے کو کندھا دینے بھی نہیں آسکا۔ مریم فیروز خان، میکی کو صرف اتنا ہی پتا چلا کہ وہ پاکستان سے فرار ہو چکا ہے۔ اور کسی ایسے سنگین معاملے میں پھنس گیا ہے۔ جس میں اللہ ہی اسے بچا کر لائے تو لائے۔

اسے خبر دینے والی عورت آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر توبہ توبہ کر رہی تھی۔ اور ایسا کرتے ہوئے اس کی آنکھوں سے بہتا بہت سا خاموش پانی اس کے میلے دوپٹے میں پھسل پھسل کر جذب ہو رہا تھا۔ اس کو جاگیر کے مالکوں نے کہاں، کیوں اور کب تکلیف پہنچائی ہوگی۔ ایسے سوال مریم نام کی کبھی اجنبی اور کبھی مہربان ہو جانے والی گوری مالکن کبھی کسی سے نہیں پوچھتی تھی۔

فہد کو خوشگوار حیرت ہوئی جب اس نے فون پر مریم فیروز معظم خان کی آواز سنی تھی۔ وہ صاف بتا رہی تھی کہ وہ ایچ آئی وی پوزیٹو ہے۔ بیمار رہتی ہے لیکن جتنی سی بھی زندگی باقی ہے، اسے ضائع نہیں کرنا چاہتی...... وہ یہ بھی نہیں جانتی کہ وہ کیا کام کر سکتی ہے لیکن کچھ ایسا ضرور کرنا چاہتی ہے۔ جس سے اس کی self loathing (خود سے نفرت کرتے رہنے) کی عادت میں کمی واقع ہو۔

فہد اسے ذہنی امراض کے اس غیر سرکاری ادارے تک لایا تھا۔ جہاں آرٹ اور رنگوں کو طریقۂ علاج کے طور پر استعمال کیا جا رہا تھا۔ مریم یا میکی وہ اب خود کو جو بھی سمجھتی ہو۔۔۔ خوش تھی، سکون میں تھی۔ زندگی میں پہلی بار ان کے پاس کچھ ایسا کرنے کو تھا جسے کرنے کے لیے وہ ہر رات صبح کی منتظر رہنے لگی تھی۔

☆☆☆

اگلے دن کے اخبارات نے ایک نئی برطانوی اسکالر کی پاکستان کے بارے میں لکھی گئی کتاب کی تقریب کا احوال اس میں شرکت کرنے والے صحافیوں کی مرضی سے شائع کیا تھا۔ لاہور کے اس سرکردہ کالج میں، جہاں پاکستان کے اعلیٰ خانوادوں کی بیٹیاں پڑھتی ہیں، کتاب کو ملنے والی پزیرائی پر صحافیوں کی رائے ملی جلی تھی...... ایک متنازع موضوع پر لکھی گئی کتاب کی رونمائی کے لیے اسی کالج کا خصوصی انتخاب کیوں کیا گیا...... اس سوال کا انہیں کوئی تسلی بخش جواب نہیں ملا تھا۔

ایک افواہ کے مطابق کتاب کی مصنفہ سبرینہ گیبرئیل کا کالج سے کوئی پرانا قلبی تعلق تھا۔ یہ بھی سننے میں آیا تھا کہ وہ کالج میں ماسٹرز لیول کا کوئی نیا ڈسپلن شروع کرانا چاہتی ہے۔

ایک انگریزی اخبار کے صحافی محمد جنید بٹ کو سبرینہ گیبرئیل کے بارے میں کوئی دلچسپ اسکوپ بھی ملا تھا۔ اس نے اپنے رپورٹنگ انچارج کو اپنی تحقیقات کے نتائج سے بڑے اعتماد سے آگاہ کیا تھا کہ سبرینہ گیبرئیل کوئی بڑا دھماکا کرنے والی ہے۔

سبرینہ گیبرئیل کوئی ایکٹریس نہیں تھی۔ کوئی بڑی بین الاقوامی صحافی نہیں تھی۔ اس کا ماضی پُراسرار تھا اور حال شاید اس سے بھی زیادہ پُراسرار...... مگر اس کی کتاب میں کچھ ایسا ضرور تھا جس نے اس ملک کی جدی پشتی اشرافیہ کلاس کے ایک مخصوص حصے کو بڑے عجیب طریقے سے چوکنا کیا تھا۔ صحافی اس کی کھوج میں تھے...... مگر وہ بڑے آرام سے ایک بار پھر اسی کالج کے ہاسٹل میں وکٹوریہ ڈیوڈ اور تزئین اظہر کی مہمان داری کا لطف اٹھا رہی تھی۔ جس کی دیواروں نے ایک بار پہلے بھی اسے دشمن دنیا سے تحفظ فراہم کیا تھا۔

ایک فرق البتہ ضرور تھا۔ اس بار ہاسٹل سے کالج گیٹ کو جاتی لمبی پگڈنڈی پر دور، دور تک کوئی اس طرف آتا

نظر نہیں آتا تھا یا شاید ایک بار پھر سبرینہ سے اندازہ لگانے میں غلطی ہوگئی تھی۔

کوئی دور سے آ رہا تھا۔ مضبوطی سے ایک کے پیچھے دوسرا قدم جماتا۔ وہ بالکل اندھی بھی ہوتی تو بھی اس مانوس سی، پُراعتماد چال کو ہزاروں لاکھوں میں پہچان سکتی تھی۔ اور یہ مان لینے میں حرج ہی کیا تھا کہ وہ کتنی شدت سے، کتنے دھیان کے ساتھ اس ایک شخص کی آہٹ کا انتظار کرتی رہی تھی۔

ہاں، وہ ڈاکٹر سبرینہ گیبریئل ایک بار پھر اس ملک کے ایک پڑھے لکھے، قابل اور ذہین سپوت کو اپنے ملک کے بارے میں اپنی رائے بدلنے کا ایک اور موقع دینے کے لیے تیار تھی۔

''کوئی حرج نہیں...... ہوتا ہے، ایسا بھی ہوتا ہے۔''

اس کے دل کے اندر کہیں دور آلتی پالتی مارے بیٹھے محتسب بدھا نے جس کی شکل پچھلے چند سالوں کی اندرونی ریاضت کے دوران اس کے باپ سے ملنے لگی تھی مسکرا کر ایک شفقت بھری تھپکی دی تھی۔

فہد مرتضیٰ اسے چائے کی پیالی پر اردو کی ایک ایسی نظم کا مفہوم سمجھا رہا تھا جو اس کے بقول اس نے پچھلے کچھ سالوں میں کسی دعا کی طرح بار، بار پڑھی تھی۔

''سنا ہے گم شدہ چیزیں جہاں پر کھوئی جاتی ہیں وہیں پر مل بھی جاتی ہیں ہاں ڈھونڈنے کی لگن ہونی چاہیے تو کھوئے کھوئے لمحے بھی لوٹ آتے ہیں۔'' وہ فاروق کی طرح جادوگر باتیں کرنے والا ذہین، اسمارٹ اور کوئی Macho اسپورٹس مین نہیں تھا۔ بس وہ ایک بہت ہی اچھا انسان تھا۔

☆☆☆

16 مئی 1995ء

کینال ویو لاہور کے ایک انتہائی پڑھے لکھے مڈل کلاس گھرانے کے ڈرائنگ روم میں سادگی سے انجام پانے والے نکاح کی خبر بظاہر عام نہیں ہوئی تھی جس کی دلہن لبنانی نژاد برٹش نیشنل، پی ایچ ڈی ڈاکٹر سبرینہ گیبریئل تھی اور دولھا ہر ایک کے بھائی بندوں جیسا ایک عام سا پڑھا لکھا، روشن ذہن، نیک دل، شریف پاکستانی......

☆☆☆

''واقعی لڑکیاں تجربے کرنے سے ڈرتی نہیں ہیں۔''

ایما گیبریئل احمد الباسم نے اپنے سوئے ہوئے ایک سالہ بچے کو برابر والی خالی نشست پر رکھی چائلڈ سیٹ پر لٹا دیا۔ ائرلائن کے علامتی نشان والا کمبل دُہرا کر کے بچے پر ڈالا۔ اس کا شوہر احمد الباسم بچے سے اگلی والی نشست پر گردن تک کمبل اوڑھے لاہور سے سارا رستہ مسلسل سوتا ہوا آیا تھا۔ لاہور جہاں وہ سبرینہ کے نکاح میں شرکت کرنے گئے تھے۔

وہ اگلے ڈیڑھ گھنٹے میں پیرس کے چارلز ڈیگال ائرپورٹ پر اترنے والے تھے۔ جہاں ایما نے اپنی مرضی اور سبرینہ کے مشورے سے اپنے باپ کے لندن والے گھر کو فروخت کر کے مستقل طور پر رہنا پسند کیا تھا۔ احمد کا سارا خاندان پیرس میں تھا اور سبرینہ کا نیا خاندان پاکستان میں۔

ایما کو واقعی یاد نہیں تھا کہ اس نے کبھی اپنی بہن کو ایک مسلمان سے شادی کرنے سے منع کیا تھا۔ اس کی اپنی زندگی میں احمد کو ملنے سے بڑی خوشی کوئی نہیں آئی تھی۔ اس نے طمانیت سے اپنے سوئے ہوئے شوہر پر نظر ڈالی۔

''اچھا ہے وہ کچھ دیر اور آرام کر لے۔''

انہیں کل سے اپنی اپنی ڈیوٹی جوائن کرنی تھی۔ بچے کے بعد سے دونوں میاں بیوی کسی یو این مشن پر ایک ساتھ نہیں گئے تھے۔

ایما نے سیٹ کی پشت سے کمر ٹکا کر گردن تک تانے ہوئے کمبل میں اپنا منہ اور بھی گھسیڑ لیا۔

''ہاں! کیا حرج ہے اگر ہم یہ سوچ لیں کہ سفر کرتے، کرتے واقعی ہمارا گھر آ گیا ہے۔''

اس نے قناعت سے آنکھیں بند کر لی تھیں۔ اسے ابھی ایک ایسے گھر کے خواب دیکھنے تھے جہاں دنیا کے دو براعظموں میں رہنے والی سبرینہ فہد مرتضیٰ اور ایما احمد الباسم کی اولادیں ایک دوسرے کے لیے بہت ڈھیر ساری گنجائش پیدا کر سکیں گی۔

(ختم شد)